ایک علمی تحریک کا دینی، علمی، فکری، ادبی اور اصلاحی ترجمان

ندائے اعتدال

دسمبر ۲۰۱۵ء

ایڈیٹر

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

فہرست مضامین

۱۔	قرآن کا پیغام	نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم	مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ	
۲۔	اداریہ	فکری زاویے	مدیر	۳
۳۔	پیام سیرت	خواہ کچھ ہو جائے، میں دین و دعوت سے.....	محمد فرید حبیب ندوی	۱۱
۴۔	// //	سید الانام اور پیغام امن-ایک جائزہ	محمد حماد کریمی	۱۳
۵۔	تاریخ کے جھروکوں سے	مسجد نبوی کے ستون-تاریخی پس منظر	محمد سراج الہدیٰ ندوی ازہری	۲۳
۶۔	// //	ٹیپو سلطان اور رواداری	محمد فرید حبیب ندوی	۲۶
۷۔	اسلامی تعلیمات	اسلام اور نحوست و بدفالی	محمد قمر الزماں ندوی	۲۹
۸۔	// //	معاشرے پر اسلامی سزاؤں کے اثرات	کفیل احمد ندوی	۳۴
۹۔	فکر اسلامی	مفکر اسلام-ایک مطالعہ (قسط-۱)	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی	۴۳
۱۰۔	ندائے اعتدال	مذہب کی تبلیغ کیجئے، مسلک کی نہیں	مفتی تنظیم عالم قاسمی	۴۹
۱۱۔	تجزیہ	پیرس نشانہ کیوں؟	اوریا مقبول جان	۵۲
۱۲۔	زبان و ادب	سیرت سید احمد شہید-ایک مطالعہ	مولانا محمد علاء الدین ندوی	۵۵
۱۳۔	تعارف و تبصرہ	اسلامی خاندان (طبع سوم)	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی	۶۲
۱۴۔	آخری صفحہ	نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر	م۔ق۔ن۔	۶۳
۱۵۔	نعت	اب بھی ہے ترا نام ہمیں جان سے پیارا	ماہر القادریؒ	

❋❋❋

نوٹ: مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ عدالتی چارہ جوئی علی گڑھ کی ہی عدالت میں ہو سکتی ہے۔

اداریہ

فکری زاویے

بہار انتخابات جمہوریت کی فتح:

جس وقت بہار میں انتخابات کا بگل بجا تو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ یہاں بھی فسطائیت پر یقین رکھنے والی جماعت میدان مار لے گی اور پھر تیزی سے ملک کو فسطائیت کی آگ میں جھلسانے کی تیاری کرے گی، غرور و انانیت کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا، زبانوں کو لگام نہیں رہ گئی تھی، انجام سے بے خبر بس فتح کے تانے بانے بن رہے تھے، کوئی مسلمانوں کو پاکستان بھیج رہا تھا تو کوئی ان سے ووٹ دینے کا حق ہی چھین رہا تھا، کوئی پارلیمنٹ میں قانون بنا کر رام مندر تعمیر کر رہا تھا، اسرائیل سے دوستی اس قدر بڑھ رہی تھی کہ اب اس کی خفیہ ایجنسی کو ہندوستان کے دفاعی نظام کا حصہ بنایا جا رہا تھا، آئی پی ایس افسران وہاں ٹریننگ کے لیے بھیجے جا رہے تھے، ہمارا یقین ہے کہ اسرائیل کا زوال لازمی ہے، پھر ان سے دوستی رچانے والے زوال پذیر نہ ہوں اس کا امکان نہیں، ان بے چاروں کو اس کا علم نہیں تھا کہ قدرت بھی اپنا کام کرتی ہے، مگر اس کی لاٹھی میں آواز نہیں ہوتی، ہر عروج کو زوال کا کیڑا لگ جاتا ہے، لیکن ''مودی لہر'' کا عروج اتنی جلدی زوال پذیر ہوگا اس کا کسی کو اندازہ نہیں تھا، جیسے غبارے سے یک لخت ہوا نکل گئی ہو، دال سستی ہوتی تو گلتی اتنی مہنگی دال گلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، ''مقدس گائے'' نے بھی ''بول و براز'' دینے پر اکتفا کیا ووٹ دلوانے سے صاف انکار کر دیا۔

ہمارے صوبے کے ''نیتا جی'' بھی کچھ اور ہی آس لگا بیٹھے تھے، پہلے اتحاد کا مضبوط حصہ بنے اور پھر خود ہی اسے توڑ دیا، طُرفہ یہ کہ بیان بھی دے ڈالا کہ ''ہاں ہم بی جے پی کو جتانا چاہتے ہیں'' اور اب تو بی جے پی کی تعریف کرتے نہیں تھکتے، حکمراں جماعت کے احمقانہ باتوں میں ماہر لیڈر نے کھل کر تعریف بھی کر ڈالی کہ نیتا جی ہر برے وقت پر پارٹی کے ساتھ رہے ہیں، وہ شبیہ جس پر اب تک پردہ پڑا ہوا تھا اب بالکل واضح ہوگئی، بہت سے لوگ جانتے ہیں، اور جو نہ جانتے ہوں انہیں جان لینا چاہیے کہ سماجوادی کی بنیاد بابری مسجد کے شہید ڈھانچہ پر ہے، وہ اسی پر کھڑی کی گئی ہے اور اس کے سہارے وہ یہاں تک پہنچی ہے، آر ایس ایس سے اس کی ساز باز، مودی و شاہ سے نیتا جی کے مذاکرات اور یوپی میں ہونے والے چھوٹے بڑے فسادات اس حکومت کی ذہنیت کو آشکار کرنے کے لئے کافی ہیں، بابری سے دادری تک اس کا کردار مشکوک رہا ہے، کنڈہ کے پولیس آفیسر سے لے کر خالد مجاہد اور اخلاق تک کی اموات اس کا چہرہ بے نقاب کرتے ہیں، اب تو بات یہاں تک پہنچی ہے کہ نیتا جی نسیان کے مرض میں مبتلا ہو چکے ہیں، پارٹی کی کشتی تین بھائیوں اور بیٹے کے درمیان ہچکولے لے رہی ہے، ٹھاکروں کی بیٹی گھر میں موجود ہے، آئندہ قدرت شاید بہت ''خوبصورت نظارہ'' کرائے، اطلاعات ہیں کہ نیتا جی موجودہ صورت حال سے بہت پریشان ہیں، لکھنؤ نہیں چھوڑ رہے ہیں، اب ان کو لالو اور نتیش کی بہت یاد آ رہی ہے، بلکہ رابطہ کرنے کی کوششیں جاری ہیں، افسوس اس بات کا ہے کہ ہماری صف

میں یا تو وہ لوگ ہیں جو سیاست کا نام آتے ہی چیں بہ جبیں ہو جاتے ہیں اور گویا اس کی بات کرنے والے کو گناہ کبیرہ کا مرتکب سمجھنے لگتے ہیں، یا پھر سطحی سوچ رکھنے والے وہ لوگ ہیں جو ہر شام سلام پیش کرنے کو حاضر ہوتے ہیں، جس کا دل چاہے وہ جا کر دیکھ لے کہ ہر شام کو ایک ''خاص شبیہ'' رکھنے والے لوگ کس طرح بڑی تعداد میں نیتا جی اور ان کے شہزادے کے پاس موجود ہوتے ہیں، اکثر تو زیارت ہی نہیں ہوتی اور جب کبھی شاہی سواری آجاتی ہے تو سب اپنی اپنی کرگزاری سنا کر اجرت طلب کرتے ہیں لیکن سوائے یاس وحسرت اور آشوا سن کے کچھ ہاتھ نہیں آتا، اسی قبیل کے کچھ بلند سطح کے لوگ ہیں جن کو بہلانے کا ہنر ''ملا ملائم'' کو خوب آتا ہے، لیکن اب عوام اس قدر سادہ لوح نہیں رہے، بہار والوں نے خوب ثابت کیا ہے، اب ضرورت ہے کام کرنے کی، شعور کو بیدار کرنے کی، جمہورت کی حفاظت کرنے کی اور اپنی قیادت کو جنم دینے کی۔

جس وقت یہ اتحاد وجود میں آیا تھا تو یقین ہو گیا تھا کہ بی جے پی اب شکست سے دوچار ہوگی، لیکن جب جمہوریت کے منافق نے عین وقت میدان چھوڑا تو خطرہ لاحق ہو گیا تھا مگر مہنگائی کے مارے عوام سے نا امیدی بالکل نہیں ہوئی تھی، اویسی صاحب سے بھی خدشہ تھا، لیکن واقعی بہار کے عوام سب پر بھاری پڑ گئے، اویسی صاحب سے عرض کیا گیا تھا کہ بغیر زمینی تیاری کے بالخصوص بہار واتر پردیش میں کامیابی کا کوئی امکان نہیں، محض سوشل میڈیا کے ذریعہ جوش میں آئے نوجوانوں پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا، پھر کسی موقع پرست کے ہاتھ میں کمان دے کر فتح کی امید بھی حماقت سے کم نہیں، کیا خوب ہوتا کہ اس اتحاد میں شامل ہونے کی اویسی صاحب ہر ممکن کوشش کرتے اور یہ ۶ سیٹیں جیت لیتے اور بہار میں مسلم اکثریت والی قیادت Muslim Dominated Party کی بنیاد رکھ دیتے لیکن.....افسوس۔

اب باری پنجاب و بنگال کی ہے اور پھر یوپی کا رخ بھی صاف ہو جائے گا، یوپی میں اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ مسلمان تقسیم نہ ہوں اور اپنی حیثیت کو باقی رکھتے ہوئے ہر یجنوں کے ساتھ متحد ہو کر فسطائی طاقتوں اور ان سے محبت کرنے والوں کو سیاست سے اس قدر دور کر دیں کہ پھر ''گھر واپسی کی مہم'' بھی ''سیاسی میدان'' میں واپس نہ لا سکے، یہ کام بہت ممکن ہے بشرطیکہ ہمارے اپنے ذہن قبول کر سکیں اور ضمیر کی ملامت پر کان دھر سکیں، سطحی سوچ اور ذاتی مفادات سے بالا ہو کر ملی مفاد میں سوچیں، یہ حقیقت جاننے اور اس سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے کہ ہندوستان کو ہندو راسٹر بنانے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ پچھڑی ذات Sc.ST کے لوگ ہیں، کیوں کہ ان کو معلوم ہے کہ ملک کے ہندو راسٹر بننے کے بعد وہ لوگ ایک ہزار سال پرانے ہندوستان میں زندگی گزارنے پر مجبور ہوں گے خواہ ملک ترقی کی معراج پر پہنچ جائے، کیوں کہ برہمن جس نسلی امتیاز پر یقین رکھتے ہیں وہ یہودی ذہنیت کے ہی مثل ہے، وہاں دوسروں کو لوٹنا اور خون چوسنا ہی کار ثواب ہے، دنیا ان ہی کے لئے ہے، دنیا کی ہر چیز پر ان کا ہی حق ہے، اگر صرف مسلمان اس راہ میں رکاوٹ ہوتے تو یہ کام کب کا ہو چکا ہوتا، لیکن ایسا نہیں ہے، شودروں کو شودر رکھنے کے لئے برہمن مسلمانوں سے بھی دوستی رچا سکتے ہیں اور ایسا انہوں نے کیا ہے جس پر ہندوستان کی تاریخ گواہ ہے، وہ کسی بھی حال میں ان کو آگے بڑھتا ہوا نہیں دیکھ سکتے۔

کیا یہ ممکن نہیں کہ اس موقع سے فائدہ اٹھایا جائے اور ہر یجنوں و مسلمانوں کے اتحاد سے اس صوبہ میں ایک پختہ بنیاد ڈالی جائے، اویسی صاحب کو بھی یہ باور کرایا جائے کہ ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی اچھی نہیں ہوتی اور تنہا ۴-۶ سیٹیں مل جانے سے

مستقبل کا مطلع صاف ہوتا بھی نظر نہیں آتا، اس لیے ضرورت ہے کہ سب ملکر ملت کے سیاسی شعور کو بیدار کریں اور صوبہ اتر پردیش سے بھی ان طاقتوں کو اس طرح کے اتحاد کے ذریعہ دور رکھیں، یاد رکھیں کہ بہت سے نادان ___ میں ان لوگوں کو نادان ہی کہوں گا ___ یہ کہیں گے کہ ملائم سب میں سب سے بہتر ہے، اور کوئی نام نہاد آزمودہ جعل ساز پستی ملت کی دہائی دے گا اور آنسو گرائے گا، مگر ان میں سے کسی کے فریب میں آنا ہی سب سے بڑا دھوکہ ہوگا، اور تقسیم کی غلطی ہوئی تو پھر کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ فسطائیت کا بول بالا ہوگا یا فسطائیت نواز کا، اگر ہمارے رہنماؤں ورہبروں نے مظفر نگر سے لیکر ''مقدس گائے'' تک کے واقعات سے سبق لیا ہو تو بہترین موقع ہے کہ ہم سب ساتھ ہو کر اس تاریخی حقیقت کا فائدہ اٹھائیں اور اپنی ایک حیثیت کے ساتھ اپنی حفاظت کا سامان خود کریں۔

پیار کی باتیں کرنے والو، قاتل کیوں بن جاتے ہو:

پیرس پر دہشت گردانہ حملہ ہوا، اطلاعات کے مطابق ۱۶۰/افراد مارے گئے، ۲۰۰/سے زائد زخمی ہوئے جن میں سے اکثر کی حالت تشویشناک بتائی گئی، دنیا سوگ میں ڈوب گئی، سب نے تعزیت کی، دہشت گردی کی اصطلاح کو جنم دینے والے امریکہ نے اسے مہذب انسانیت پر حملہ قرار دیا، کسی نے اس کو انسانیت پر حملہ کہا، کسی نے انسانیت سوز اور گھناؤنا ظلم کہا، ظلم وجبر کے علمبردار اسرائیل نے بھی گھڑیالی آنسو بہائے اور فرانس کی مدد کا وعدہ کیا، بالخصوص اپنی جاسوسی طاقت جھونک دینے کی یقین دہائی کرائی، ہم بھی اسے انسانیت سوز جرم ہی کہتے ہیں، ظلم کسی پر ہو، کہیں بھی ہو، کرنے والا کوئی ہو اس کی پرزور مذمت کی جانی چاہیے، ہم ایسا کیوں نہ کریں جبکہ ہماری مذہبی تعلیم قتلِ ناحق کو انسانیت کا قتل قرار دیتی ہے۔

لیکن سچ پوچھیے تو آج فرانسیسوں کے خون پر ہمیں بڑا رشک آیا، ایسا لگتا ہے کہ ان کا خون مشک وعنبر ہو جس پر دنیا فریفتہ ہوتی ہے اور قوم مسلم کا خون حنظل کا عرق ہو جسے بہا دینا ہی ضروری ہوتا ہے، پوری دنیا جب اس حملہ کے بعد آہ وفغاں کرنے لگی اور اسے انسانیت پر ظلم اور مہذب دنیا پر حملہ قرار دینے لگی، ہر کوئی اس برے وقت میں فرانس کے ساتھ کھڑا نظر آنے لگا، اس کی مدد کی یقین دہانی کے ساتھ ظلم ودہشت گردی کی دہائی دینے لگا، سب محبت واخوت کی باتیں کرنے لگے، الفتوں کے گیت گانے لگے اور ہمارے بے بس وبے کس بھائی بھی فرانس کا جھنڈا ہاتھ میں لے کر اظہار ہمدردی کرنے لگے اور بے شرم مسلم حکمراں تو ایسے آنسو بہانے لگے گویا ان کے گردوپیش کبھی کوئی حملہ ہوا ہی نہیں، بس دنیا نے پہلی مرتبہ یہ ظالمانہ اور بہیمانہ کارروائی دیکھی ہے، میرے جی میں آیا کہ اس موقع پر حفیظ مرحوم کی زبان میں ان میٹھی میٹھی باتیں کرنے والوں سے یہ پوچھوں۔

ہم بھی تو انسان ہیں آخر، ہم سے یہ نفرت کیسی
سب سے لپٹ کر ملنے والو، ہم سے کیوں کتراتے ہو

جی میں آیا کہ اہل یورپ سے سوال کروں کہ ظلم جب یورپ کے کسی خطہ میں ہو تبھی وہ ظلم قرار پائے گا، افریقی وایشیائی ممالک میں معصوموں کا خون یورپ بہائے تو اسے ظلم نہیں کہا جائے گا، کیا کوئی دن فلسطین میں ایسا گزرتا ہے جب وہاں لاشیں نہ گرتی ہوں، جب وہاں معصوموں اور مظلوموں کا قتل نہ ہوتا ہو، جب اخبار میں ''اسرائیلی فوج کی وحشیانہ کارروائی'' اسرائیلی فوج کی بربریت'' جیسی سرخیاں نہ نظر آتی ہوں، کیا غزہ کو قبرستان بنانا اور اس کی آبادی کو کھنڈر میں تبدیل کر دینا یورپی تہذیب کا حصہ ہے، کیا گزشتہ دو دہائیوں سے عراق میں یورپ وامریکہ کے ذریعہ کھیلی جانے والی خون کی ہولی مغربی تہذیب کا کارنامہ ہے، کیا افغانستان

پر ۴۷ ممالک کے اتحاد کی بہیمانہ کارروائی اور لوگوں کے سرکاٹ کر پھر لاشوں میں کیمیکل ڈال کر Dead Body Dancing سے لطف اندوز ہونا بھی ظلم نہیں ہے، کیا اسپتالوں، اسکولوں اور عبادت گاہوں کو نشانہ بنا کر معصوموں کے چیتھڑے اڑانا مہذب دنیا کے لئے روا ہے، کیا فرانس کے لئے الجزائر پر ظالمانہ تسلط اور بے دریغ قتل عام انسانیت کی تعمیر کے لئے درست تھا، کیا وہاں علماء وعوام کا اجتماعی قتل نہیں کیا گیا، کیا وہاں لوگوں کے سرکاٹ کر انہیں ہاتھ میں اٹھا کر فرانسیسی لشکر کے بہادر فوجیوں نے یادگار تصویریں نہیں بنوائیں، کیا فرانسیسی استعمار نے شام کو اپنی ہوس کا نشانہ نہیں بنایا، کیا اس نے وہاں سے جاتے جاتے شام کو ''وحشی وقصاب'' کے حوالے نہیں کیا، کیا آج بھی وہ شام میں منصفانہ کردار ادا کر رہا ہے، لیکن پھر بھی یہ ہمارا مذہب ہی ہے جو ہمیں یہ حوصلہ دیتا ہے کہ تمہارے غم میں ہم شریک ہیں لیکن.....لیکن اظہار یکجہتی وغم خواری کے لئے بڑا جگر چاہیے، آج فلسطین کے شہیدوں کی لاشیں اور الجزائر سے شام تک کے شہداء اور برما کے مظلوم مسلمان تصویر حسرت بن کر انسانیت کی دہائی دینے والوں سے پوچھ رہے ہیں۔

ہمسایوں سے ہم وطنوں سے یہ لاشیں پوچھا کرتی ہیں
پیار کی باتیں کرنے والو، قاتل کیوں بن جاتے ہو

بہر حال حملہ جو ہوا وہ یقیناً غلط ہوا، لیکن صرف اسی حملہ کی اس قدر گونج یہ ذرا تعجب خیز ہے، اس سے تین دن قبل لبنان کے حملہ پر واویلا کیوں نہیں، پانچ دن قبل بغداد کے حملے پر خاموشی کیوں، روزانہ ہونے والی فلسطینی شہادتوں پر سکوت کیوں، جان تو جان ہے خواہ کسی کی ہو!! یا بے کس کو جینے کا بھی حق نہیں، صحیح یہی ہے کہ انسانی قانون اور دنیاوی نظریات میں جینے کا حق صرف طاقت ور کو ہے، سیکولرزم کا صحیح مفہوم جس کی لاٹھی اس کی بھینس ہے، اس میں انسانیت اور اقدار کی کوئی قیمت نہیں، یہاں شخصیت کا وزن اور امتوں کی تاریخ سے کوئی سروکار نہیں، یہاں تو بس سروں کی گنتی ہوتی ہے، امراء کی خوشی میں خوشی ہے اور ان کا غم ہی غم ہے، یہود ونصاریٰ تو اسی کے قائل ہیں اور اس کے لیے انہوں نے اپنی مقدس کتب میں تحریف تک کر ڈالی ہے، چنانچہ آج یورپ زبان حال سے امت مسلمہ کو یہ باور کرا رہا ہے کہ تمہارا خون بے قیمت ہے، تمہارے ہی پٹرول سے ہم تمہیں آگ لگائیں گے اور جشن منائیں گے، لیکن اگر ہماری (یہود ونصاری) آپسی نا اتفاقی کے سبب کوئی حادثہ ہو جائے اور اس میں کچھ جانیں تلف ہو جائیں تو اس پر نہ صرف خمیازہ بھی تم کو ہی بھگتنے پر مجبور کریں گے بلکہ یہ احساس بھی دلائیں گے کہ ہمارے خون کی سرخی ایسی ہے کہ اسے دیکھ کر دنیا بھر سے چیخیں اٹھنے لگی ہیں اور تمہارا خون ہے کہ پانی کی طرح بہتا ہے اور مہذب دنیا اسے خون بھی تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں۔

حملہ کیوں ہوا اور کس نے کیا، اس کے جواب میں مختلف تبصرے آئے ہیں اور آتے رہیں گے، اس پر سب کا اتفاق ہے کہ یہ حملہ افسوسناک اور قابل مذمت ہے، لیکن اس سے آگے سب کی باتیں مختلف ہیں، کوئی اسے عمل کا ردعمل قرار دے رہا ہے جو انتہائی احمقانہ اور حقائق سے ناواقفیت کی دلیل ہے، کسی کو خودکش حملہ آور کے فنا ہو جانے کے بعد بھی شامی پاسپورٹ مل رہا ہے، پتہ نہیں یہ پاسپورٹ کس دھات کا بنا تھا کہ بچ گیا۔ کوئی یہ کہتا ہے کہ مغرب کو اپنی خارجہ پالیسی پر نظر ثانی کرنا چاہیے، کسی کے مطابق شیشہ کے گھر میں بیٹھ کر اپنے کو محفوظ سمجھنا حماقت ہے، کسی کے مطابق شام میں فرانس کے کردار کا یہ ردعمل ہے اور سب سے آسان تبصرہ یہ ہے کہ یہ حملہ داعش نے کیا ہے، اور کسی کے مطابق یہ اسرائیلی دہشت گردی کا ایک اور نمونہ ہے، یہ تبصرہ سب سے زیادہ حساس بھی ہے اور اسی کے مبنی بر حقائق ہونے کا امکان بھی ہے، اسرائیل بھی عجیب چیز ہے کہ اس کی حفاظت بھی یورپ اپنی ذمہ داری سمجھتا ہے اور اسے

بے نکیل چھوڑ دینا بھی حماقت تصور کرتا ہے، اس وقت دنیا بھر میں اسرائیل کے خلاف ایک منفی رائے ہموار ہو رہی تھی، شام میں روس کی مداخلت اور اس کو حملہ کی دعوت امریکہ کی کمزوری یا شکست تسلیم کرنے کا اشارہ تھا، یاد ہوگا کہ ۲۰۱۲ میں فلسطین کو UNO میں آزاد ریاست کی حیثیت سے تسلیم کرنے کے لئے جن ۱۴ ممالک نے ووٹ دیا تھا اس میں فرانس بھی شامل تھا، اس موقع پر نیتن یاہو نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ فرانس یہ غلطی نہ کرے کہ جو اسرائیل کو تسلیم نہیں کرتا وہ اسے آزاد ریاست کی حیثیت سے تسلیم کرے ورنہ اسے خمیازہ بھگتنا پڑے گا، یہ سب اسباب اس خیال کو تقویت پہنچاتے ہیں کہ یہ حملہ اسرائیلی خفیہ کارروائی کا نتیجہ ہو، کیوں کہ مجھے اس حقیقت کا ادراک ہے کہ کوئی مسلمان معصوموں کا قاتل نہیں ہوسکتا، جن لوگوں کا نظریہ خلافت الٰہیہ کے قیام کی بنیاد پر قائم ہے وہ اپنے قریبی سیاسی حریف اور مخالفین کے قاتل تو ہوسکتے ہیں لیکن معصوموں کے نہیں، جو شخص بھی معصوموں اور بے گناہوں کے قتل میں ملوث ہوگا بعد از تحقیق واضح ہو جائے گا کہ وہ مسلمان نہیں تھا اور اگر خدانخواستہ مسلمان تھا تو اسرائیل کے ہاتھوں اپنے ایمان کا سودا کر چکا تھا، اب تک سارے بڑے دہشت گردانہ حملے متعدد تحقیقات کے بعد یہ واضح کر چکے ہیں کہ وہ اسرائیلی و امریکی سازشوں کا نتیجہ تھے، 9/11 کے بعد جو قیامت افغانستان پر ٹوٹی اس پر کتنے ہی امریکی مفکرین کے بیانات موجود ہیں کہ وہ ایک سازش تھی جس سے مسلمانوں کا کوئی رشتہ نہیں، ایک ہیمنت کرکرے کو مارنے کے لیے کتنی بڑی سازش موساد و آر ایس ایس نے رچی کہ وطن عزیز کے پورے دفاعی نظام پر سوالیہ نشان لگا دیا، پاکستان کے آرمی اسکول پر جو حملہ ہوا وہ بھی کسی مسلمان نے نہیں کیا خود وہاں کے یہودی تسلط سے آزاد اخباروں کی تحقیقات نے اسے ثابت کر دیا، اس لیے قطعاً ایسے مواقع پر دفاعی انداز اختیار کرنے کی ضرورت نہیں، خود اعتمادی کے ساتھ تحلیل و تجزیہ کیجئے تو اس حقیقت تک پہنچنا بہت آسان ہوگا کہ اس طرح کے سارے حملے صہیونی سازش کا نتیجہ ہیں اور اگر اس میں کہیں کچھ مسلمان ملوث ہیں تو وہ ان کے زر خرید ہیں، لیکن ایسا بہت کم ہے بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے، عربوں پر کنٹرول باقی رکھنے کے لئے اسرائیل کی بقا اور اس کی حفاظت مغرب کی مجبوری ہے، اور اس کا بے نکیل ہو جانا یہ **وقالت النصاری لیست الیھود علی شیء** کے بیان کی صریح خلاف ورزی ہے، خود اسرائیل کو اپنے فروغ اور گریٹر اسرائیل کی تعمیر کے لیے ہی نہیں بلکہ اپنے بقا کے لئے بھی پوری دنیا کو سازشوں کے جال میں الجھانا، قتل و خون کا کھیل کھیلنا، ذہنی عیاشی کو فروغ دینا اس کی مجبوری ہے، جس کے سنگین نتائج دنیا بھگت رہی ہے، اس سے نجات اسرائیل کے زوال سے ہی ممکن ہے۔

ابھی کچھ دن قبل یہ رپورٹس آ رہی تھیں کہ شام میں بشار کی فوجیں ہزیمت سے دوچار ہو چکی ہیں، ایرانی ملیشیا اور حزب الشیطان کے کارندوں نے بیڑا اٹھا رکھا ہے، اسرائیل کی حفاظت کے لئے شام نہایت اہم ملک ہے، اور شام کو اپنے من موافق باقی رکھنے کے لئے بشار کی ضرورت ہے، چنانچہ کون سا ملک باقی رہ گیا ہے جو وہاں معصوموں کی جانوں سے کھلواڑ نہیں کر رہا ہے، گزشتہ دنوں ترکی کے کچھ معاہدے فرانس سے ہوئے تھے اور ترکی کا موقف شام کے سلسلہ میں ذرا مختلف ہے، اب فرانس نے علی الاعلان شام میں بمباری کا نہ صرف اعلان کر دیا ہے بلکہ شروعات کر دی ہے، حالات میں سدھار کی امید جیسے اب باقی نہ رہی، اگر عربوں نے ہوش کے ناخن نہ لیے اور بتدریج حکمت کے ساتھ مغرب کے تسلط سے اپنے کو آزاد کرنے کی ابتدا نہ کی تو بہت ممکن ہے کہ دو عظیم جنگیں عیسائی دنیا میں لڑی گئیں اور تیسری عالمی جنگ مشرقی وسطی میں ہو، پوپ فرانس نے بھی یہی کہا ہے کہ دنیا تیسری جنگ عظیم کی طرف بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے۔

لمحۂ فکریہ

پیرس حملہ کے بعد جس طرح ہمارے ملک کی ایک بڑی جمعیت نے دہشت گردی کے خلاف تحریک چھیڑی اور ملک کے ۲۷ شہروں میں احتجاج درج کرایا وہ یقیناً قابل تعجب ہے، ہم ہی نہیں ملک کا سنجیدہ طبقہ سراپا حیران ہے اور اس کے سامنے یہ احتجاج ایک سوالیہ نشان ہے، پھر یہ کہ جمعیت کے ساتھ دیگر ملی تنظیمیں بھی شامل ہیں، آخر کیوں؟؟ ممکن ہے کہ جواب دیا جائے کہ ہمارے ملک میں جو حالات ہیں ان میں ضروری تھا کہ مسلمان یہ باور کرائیں کہ ہم دہشت گردی کے خلاف ہیں، لیکن کیا اس کے لیے پہلے کی گئی کانفرنسیں کافی نہیں تھیں، کیا دارالعلوم دیوبند کی گراؤنڈ دہشت گردی مخالف کانفرنس کافی نہ رہی، ممکن ہے مذکورہ بالا جواب صحیح ہو اور یہی باعث جواز ہو، مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بے وقت کی شہنائی ہے، انتہائی ناموزوں اور غیر متوازن اقدام ہے، پیرس حملہ کے متصلا بعد یہ تاثر دینا کہ واقعی یہ بڑا حملہ ہے یہ سوال پیدا کرتا ہے کہ مسلمانوں پر روز جو حملے ہوتے ہیں ان کی کوئی اہمیت نہیں، پھر ایسی حالت میں کہ براہ راست ان حضرات کے پاس کوئی معلومات نہیں کہ اس حملے کی کہانی کیا ہے، اگر میڈیا کے بقول یہ حملہ داعش کا ہی ہے تو سب کو یہ باور کرایا جا چکا ہے کہ داعش سے مسلمانوں کا کوئی رشتہ نہیں، اور پھر داعش کون ہیں، اسرائیل و امریکا کے ان سے تعلقات ہیں یا نہیں، یہ حملہ وہ یہودی اور فرانسیسی ایجنسیوں کے تعاون کے بغیر کس طرح کرنے میں کامیاب ہو گئے؟ اس طرح کے بہت سے سوالات تھے جن کے جواب سے قبل ملک گیر مظاہرے، ماشاءاللہ!!

سوال یہ ہے کہ کیا جمعیت نے گزشتہ ۵ سالوں میں شام کے مظلومین کے لئے ایسی کوئی ملک گیر تحریک چلائی، کیا مصر میں اخوانیوں کے قتل عام پر اس کو غیرت آئی تھی، کیا یورپ کی دھشت گردی پر اس نے اس طرح کا بڑا احتجاج کیا، کیا فلسطین میں ہونے والے طویل ظلم کے خلاف ایسی زبردست آواز اٹھائی، کیا ہزاروں بے گناہوں کے قاتل سیسی کی آمد پر اس نے کوئی احتجاج کیا، کیا ملک میں ہونے والے فسطائی حملوں پر گزشتہ ڈیڑھ سالوں میں کوئی نشاط نظر آیا، کیا جس وقت ملک میں غیر جمہوری اور تخریبی عناصر زوروں پر تھے اور ملک میں فرقہ واریت شباب پر تھی اور لگ رہا تھا کہ فسطائیت کے ڈھیر پر ملک کھڑا ہے، ایسے میں صنم خانے کے کچھ لوگ ایوارڈ واپس کر رہے تھے اور مختلف انداز میں دفاع کر رہے تھے اور اپنی قومی غیرت کا ثبوت دے رہے تھے، اس وقت بھی یہ خیال نہیں آیا کہ ان کی تایید کی جائے، ان کا اکرام کیا جائے اور ان کو اعزاز دے کر فسطائی طاقتوں کو کمزور کیا جائے۔ کیا عراق میں گزشتہ ۱۵ سالوں میں امریکہ نے جو کچھ طوفان برپا کیا اس پر رگ غیرت پھڑکی، کیا شام کے مسلمانوں پر جو قیامت صغریٰ گزر گئی اور فلسطین میں جو گزر رہی ہے اس پر کبھی خون میں ابال آیا، کیا مسجد اقصیٰ کی پامالی اور بے حرمتی اور ہندوستانی حکومت کی اسرائیل دوستی پر یہ علماء سڑک پر اترے۔

ہماری جن اصحاب فکر اور سنجیدہ علماء سے گفتگو ہوئی وہ ماتم کناں نظر آئے، وہ حیرت و استعجاب سے زمین میں گڑے جا رہے تھے، کیا فہم و فراست ایمانی اور غیرت دینی کا یہی تقاضہ ہے کہ امت کو دفاعی کٹہرے میں کھڑا کر دیا جائے، کون ہے جو داعش کی مذمت نہیں کرتا، کون ہے جو سخت گیری اور شدت پسندی اور دہشت گردی کی مذمت نہیں کرتا، کس مسلمان نے دہشت گردانہ حملوں کو گناہ قرار نہیں دیا، کس مسلمان نے ملک کا دفاع نہیں کیا، کس نے قانون کی پاسداری نہیں کی، کس نے دہشت گردوں سے نفرت کا اظہار نہیں کیا، پھر آخر ضرورت کیا پڑی تھی ملت کو دفاعی احساس میں ڈھکیلنے اور مجرم کے کٹہرے میں کھڑا کرنے کی، کیا

امریکی اور اسرائیلی اور فرانسیسی دھشت گردی کے خلاف احتجاج کرنے کی جرأت کی گئی، کیا کبھی یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ دہشت گردی کی اصطلاح کو تم نے جنم دیا، تم ہی پالتے ہو، تم ہی حملے کراتے ہو اور تم مزے لیتے ہو۔

کیا یہ سمجھ لیا جائے کہ اب عقل وفہم کے دیوالیہ پن کا زمانہ آچکا ہے یا پھر غیرت ایمانی کے ختم ہونے کا ماتم کیا جائے، ان مظاہروں کا مقصد کچھ بھی ہو لیکن ساتھ ہی یہ پیغام بھی جائے کہ ہم اس کے خلاف سراپا احتجاج ہیں جو تمہارے بالمقابل ہو، تم شوق سے شام وفلسطین میں اپنی پیاس بجھاؤ اور بچوں اور عورتوں کا خون پیو، مسجد اقصی کو روز جوتوں سے رودوں اور جس طرح چاہو فلسطینیوں کو مارو ہم اف بھی نہ کریں گے، جن شامیوں نے دیکھا ہوگا کس طرح ان کے آنسور کے ہوں گے اس مظاہرے پر، فلسطین کے بچے بھی ہمارے علماء کرام کی فہم وفراست پر افسوس کر رہے ہوں گے، سوچ رہے ہوں گے کہ اس وقت اس بیان کی ضرورت اور احتجاج کا مطلب کیا ہے، ہر چھوٹی بڑی تنظیم نے پہلے ہی اعلان کر رکھا ہے کہ دہشت گردی کا اسلام سے کوئی رشتہ نہیں تو پھر ایسے پھر پور دفاع کی کیا ضرورت۔ عوام کو اب سمجھنا اور سمجھانا پڑے کا مصلحت کے نام پر سکوت سے دستبردار ہونا پڑے گا، کہ اکثر جلسہ اور جلوس اور مظاہروں کی سیاست میں سوائے سیاسی مفادات کے کچھ مقصود نہیں ہوتا، یوروپ اور برطانیہ کا سفر ہوتا رہے، شبیہ صاف رہے، صدق ووفا کی سند ملے، حکومت سے قربت پڑھے، چاہے مسجد اقصی کی روح تڑپ جائے، شہدائے فلسطین کی روحیں سراپا سوال بن جائیں، عراق وشام کے مظلوم عوام تعجب سے پتھر ہو جائیں، تو کیا فرق؟

بات حملے کی تھی تو مذمتی بیانات سے اپنی بات کہی جاسکتی تھی، امت کو جرم کا احساس دلانے اور کٹہرے میں کھڑا کرنے کی کیا ضرورت تھی، وہ بھی ایسے وقت میں جب بے شمار غیر مسلم دانشوران بھی یورپ کے ظلم وجبر پر سراپا احتجاج بنے ہوئے ہیں، کیا مارکنڈے کاٹجو جیسی حق بیانی بھی ہمارا نصیب نہ رہی، اکثر نے یہی لکھا جو ہوا وہ قابل مذمت ہے لیکن اس سے پہلے یورپ جو کچھ کر رہا تھا وہ اس سے زیادہ قابل مذمت ہے اس کی بھی ایسی ہی مذمت کی جانی چاہیے جیسے اس حملہ کی کی جارہی ہے، اگر احتجاج اور ملک گیر احتجاج کی ضرورت تھی تو پہلے عراق وشام کے مظلوموں کے لئے اور سب سے بڑھ کر مسجد اقصی اور فلسطین پر ہونے والے مظالم اور اسرائیل ویورپ کی دہشت گردی کے خلاف ____ شاید اللہ تعالیٰ کے سامنے بھی اس کا جواب دیتے نہ بن پڑے، مگر کیا کیجئے ؎

حمیت نام تھا جس کا گئی تیمور کے گھر سے

ایک کشمکش اور حل کی تلاش:

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے کسی موقع پر فرمایا تھا کہ ہمارے معاشرے میں پائی جانے والی کشمکش کا بڑا سبب یہ ہے کہ جن لوگوں کے پاس دینی وملی شعور ہے ان کے ہاتھ میں ملک کا نظام نہیں اور جن کے ہاتھ میں نظام ہے وہ دینی وملی شعور سے بیزار وبے بہرہ ہیں، یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارے مدارس معاشرے کی اہم اور بنیادی ضرورت کو پورا کر رہے ہیں اور بری حد تک اپنی ذمہ داری کو نبھا رہے ہیں، یہ بھی حقیقت ہے کہ کسی انقلاب کی امید بھی ان ہی لوگوں سے کی جاسکتی ہے جنہوں نے وقت کے تقاضوں کو بھانپنا اور اس کے مطابق فیصلے کرنا سیکھا ہو، پھر اس میں بھی شک نہیں کہ ہمارے وہ ادارے جو عصری تعلیم کے لئے قائم کیے گئے، وہ موقع پرستوں، صرف کمانے کی فکر کرنے والوں کے علاوہ سرفروشوں اور مردان کار پیدا کرنے سے قاصر ہیں، شواذ ہر جگہ ہوتے ہیں وہ موضوع بحث نہیں، اس میں ان اداروں اور اس کے بانیوں اور اس کے منتظمین کا قصور نہیں، قصور اس نظام کا

ہے جس کے وہ تابع ہیں، کرشمہ اس نصاب کا ہے جس کو وہ معراج سمجھتے ہیں، آخر اس سلسلہ میں اقدام سے کون سی چیز مانع ہے کہ اس نعرے کو حقیقت وعمل میں نہیں تبدیل کیا جاسکتا کہ اسلام علم میں دوئی کا تصور نہیں رکھتا یا علم میں ثنویت کا تصور غیر اسلامی ہے۔

بعض لوگوں نے اقدامات کیے تو خالص قدیم طرز کے مدرسے ایک طرف قائم کر دیے اور خالص معاصر نظام کے تابع تعلیمی ادارے ایک جانب، اس میں ٹوپی اور نماز کے چلن سے اسلام کی فتح کا تصور جی ہی جی میں پنپنے لگا، کیا کہیے اقبال کو کہ وہ ایسی خدا لگتی باتیں کہہ گئے ہیں کہ جب ان پر نظر پڑتی ہے تو اپنا کھوکھلا پن اور کم ظرفی آشکار ہو جاتی ہے، کیا خوب کہا اقبال نے ؎

ہند میں ملا کو ہے جو سجدے کی اجازت
نادان سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

یہ ہے ہماری خدمات کا محور، اور اس سے آگے بڑھ کر یوں کہا ؎

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے نمناک
نہ زندگی نہ محبت نہ معرفت نہ نگاہ

آج ہمارے تعلیمی اداروں کا حال کچھ ایسا ہی ہے اور اس پر تعریفوں کے اتنے پل باندھے جاتے ہیں کہ عجیب اکتاہٹ سی ہوتی ہے، اگر ہمارے زیر انتظام اداروں سے بھی بیدار مغز اور ملی شعور سے سرشار افراد کار کے بجائے محض وہی خام مال نکلے جو دیگر اداروں سے نکلتا ہے تو پھر فرق کیا رہ گیا، یقیناً کچھ ادارے ایسے بھی وجود میں آئے ہیں جن میں کچھ نہ کچھ دینی تعلیم کا نظم بھی Islamic studies یا Theology کے نام پر ہے، کچھ نے اس سے آگے کی کوششیں کی ہیں، کچھ مدارس نے NOS کا نظام نافذ کر رکھا ہے، لیکن یہ سب کوششیں اب تک تنظیم وترتیب کے ابتدائی مراحل بھی طے نہیں کر پائی ہیں۔ مشاہدات کہتے ہیں کہ ضرورت پوری نہیں ہو رہی ہے، معاشرے کا اضطراب بڑھتا جا رہا ہے اور مدرسہ واسکول کی کشمکش میں قوم اپنا توازن کھو رہی ہے۔

کیا اس کا امکان نہیں کہ ثانویہ کی تعلیم کو اس قابل بنایا جائے کہ مدرسہ واسکول کی تفریق ختم ہو جائے اور فکری پختگی کے ساتھ بچہ جو بھی میدان علم چاہے ہائی اسکول کے بعد اسے منتخب کر لے، پھر نہ وہ نرا مدرسہ کا فارغ ہو کہ دنیا کے نظام سے اس کا کوئی واسطہ نہیں اور نہ ہی اس کی دنیا پیٹ تک محدود ہو کر رہ جائے، کہ حصول تعلیم کا مقصد بس پیٹ پوجا ہو اور مذہب وملت کی فکر سے یکسر عاری ہو جو عصری نظام ونصاب کی لازمی خاصیت ہے، کیا واقعی ترکی کے مدارس الائمہ والخطباء نے اس کا کامیاب تجربہ کیا ہے، کیا اس راستہ کو اپنا کر معاشرے کی کشمکش پر قابو پایا جاسکتا ہے، اگر ہاں! تو پھر اس طریقۂ کار کو اپنایا کیوں نہیں جاتا، اگر نہیں تو پھر اس میں قباحتیں کیا ہیں، ہمیں امید ہے کہ اہل علم واصحاب نظر اپنی آرا سے ضرور نوازیں گے۔

☆☆☆

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

پیام سیرت

خواہ کچھ ہو جائے!

میں دین و دعوت سے دستبردار نہیں ہو سکتا!

محمد فرید حبیب ندوی

ہم تمہارے سامنے تین آپشن رکھتے ہیں:
چاہو تو سرداری قبول کرلو۔
چاہو تو سارا خزانہ تمہارے قدموں میں ڈھیر کردیں۔
چاہو تو خوبصورت ترین دوشیزہ سے تمہاری شادی کرادیں۔
ان تین باتوں میں سے جو چاہو قبول کرلو۔
مگر ہماری ایک شرط تسلیم کرلو۔
ہماری ایک بات مان لو۔
اپنے دین کی تبلیغ سے رک جاؤ۔
اپنی دعوت سے باز آجاؤ۔
توحید کے اعلان سے دستبردار ہو جاؤ۔
حق کو حق اور باطل کو باطل کہنا چھوڑ دو۔
شرک کو شرک اور توحید کو توحید کہنے سے رک جاؤ۔
اس کے بدلہ جو چاہو لے لو، سرداری یا مال و دولت، زر یا زن۔
نہیں، کبھی نہیں۔
ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔
میں اپنی محنت سے کبھی دستبردار نہیں ہوسکتا۔
میں اپنے کام میں کبھی سستی نہیں کرسکتا۔
میں اپنی دعوت کا سودا نہیں کرسکتا۔
میری یہ دعوت، میرا یہ دین کوئی بکاؤ مال نہیں۔
میرا دین کوئی قابل فروخت شئے نہیں۔
اگر تم آسمان سے تارے توڑ کر بھی لادو۔
اگر تم سورج کو بھی میری ہتھیلی پر لاکر رکھ دو۔
اگر تم چاند کو بھی میرے ہاتھ میں دے دو۔
دنیا کی قیمتی سے قیمتی متاع۔
دنیا کا تمام ساز و سامان۔
اور اس عالم آب و گل کا دانہ دانہ میرے سامنے پیش کردو۔
تب بھی میں اپنے کام سے دستبردار نہیں ہوسکتا۔
میرے اس کام کی عظمت تک تمہاری رسائی نہیں ہے۔
میرے اس دین کی اہمیت کو تم نے سمجھا نہیں ہے۔
یہ وہ نعمت بے بہا ہے جس کا کوئی بدل نہیں۔
یہ وہ مایۂ گراں قدر ہے جس کا کوئی عوض نہیں۔
یہ وہ پیش قیمتی متاع ہے جس کا کوئی معاوضہ نہیں۔
تم جو چاہو کرلو، مگر میں اپنے اس کام سے دستبردار نہیں ہوسکتا۔

یہ گفتگو مکہ کے رؤساء قریش اور اسلام کے داعی اول حضور اکرم ﷺ کے درمیان ہو رہی تھی۔

ایک طرف سے پیش کش تھی:
حسن کی، خوبصورتی کی، جمال کی۔
سرداری کی، حکومت کی، کرسی کی، اقتدار کی، سلطنت کی۔
مال کی، دولت کی، سونا چاندی کی، زر و جواہرات کی، درہم و دینار کی۔
اور دوسری طرف سے انکار تھا، بس انکار۔
ان حقیر مادی چیزوں پر قدم کی ٹھوکر تھی۔
ان زوال پذیر لبھانے والی اشیاء پر نظر حقارت تھی۔

اسے نہ دین کے بدلہ سرداری منظور تھی، نہ دولت قبول تھی اور نہ حسن مقبول تھا۔

حقیقت یہی ہے کہ ہر زمانہ میں:

اہل حق کو ورغلانے کے لئے۔
اہل دیانت کو بھٹکانے کے لئے۔
اہل امانت کو گمراہ کرنے کے لئے۔
سچے لوگوں کو بے راہ کرنے کے لئے۔
صالح نفوس کو مقصد سے ہٹانے کے لئے۔
یہی تین حربے ہمیشہ استعمال کئے گئے ہیں۔

کل بھی کئے گئے تھے اور آج بھی کئے جارہے ہیں، مادیت پرست دنیا نے روحانیت کو خریدنے کے لئے یہی قیمت پیش کی ہے۔

ظاہر پرست دنیا نے حقیقت کی ہمیشہ یہی بولی لگائی ہے۔
اس وقت بھی یہ دنیا امت مسلمہ کے سامنے۔
یہ تینوں آپشن رکھتی ہے۔
کہ اسلامی تعلیمات سے دستبردار ہو جاؤ۔
اسلامی ثقافت سے پہلو تہی اختیار کرلو۔
اسلامی تہذیب کو چھوڑ بیٹھو۔
اسلامی رنگ کو اپنے اوپر سے اتار دو۔
اسلامی شریعت کو پس پشت ڈال دو۔
اسلامی سیاست اور اسلامی اقتصادیات کو بھول جاؤ۔

اس کے لئے:

اعزازات دے جاتے ہیں۔
ڈگریاں پیش کی جاتی ہیں۔
انعامات سے نوازا جاتا ہے۔
حسن وخوبصورتی کے نظارے کرائے جاتے ہیں۔
خزانوں کے دہانے کھول دئے جاتے ہیں۔
سبز باغ دکھائے جاتے ہیں۔
عزت وشہرت دینے کے وعدے کیے جاتے ہیں۔
اسلام کے خلاف بولو۔
اسلام کے خلاف لکھو۔
سچ کو غلط اور غلط کو سچ ثابت کرو۔
حق کو باطل اور باطل کو حق بنا کر پیش کرو۔
ظلم کو انصاف اور انصاف کو ظلم بتاؤ اور لکھو۔

اس کے لئے:

جو چاہو انعام قیمت لے لو۔
من پسند عوض لے لو۔
منہ مانگی قیمت لے لو۔
عزت، شہرت، ڈگری، کرسی، پیسہ، حسن و خوبصورتی جو چاہیئے، لے لو۔

لیکن جو اس محمد عربی ﷺ کے جانشین ہیں سوال ان سے ہے:

کہ کیا تمہیں دین کے بدلہ یہ سودا منظور ہے؟
کیا تمہیں دین کی قیمت قبول ہے؟
کیا تم اس کے لئے اپنی دعوت سے دستبردار ہو سکتے ہو؟
کیا تم اس کے لئے اپنے مذہب سے اپنا رشتہ توڑ سکتے ہو؟
کیا تم اس کے لئے ضمیر فروش بن سکتے ہو؟

اگر تم اس محمد عربی ﷺ کے سچے جانشین ہو تو پھر جس طرح اس نے ان چیزوں کو ٹھکرا دیا تھا، تم بھی ٹھکرا دو۔
جس طرح اس نے یک لخت سودے کو ختم کر دیا تھا، تم بھی کر دو۔

دین بیچ کر۔
مذہب بیچ کر۔
ایمان کا سودا کر کے۔
اور اسلام کی قیمت لگا کر۔

اگر تمہارے سامنے اس دنیا کیا، زمین وآسمان کی بادشاہی پیش کی جائے۔
ساری دنیا کا خزانہ بھی تمہیں دیا جائے
تو اپنے رسول کی طرح تم بھی اس سودے کو قبول نہ کرنا۔
ایمان کی حفاظت کرو۔
اسلام کو سینے سے لگاؤ۔
اسلامی تعلیمات کو سرمۂ چشم بناؤ۔
اور دین کی دعوت میں لگے رہو۔
یہ ہمارے لئے سیرت کا سب سے اہم پیغام ہے۔

☆☆☆

پیام سیرت

سید الأنام

اور پیغام امن وسلام-ایک جائزہ

محمد حماد کریمی
hammadkarimi93@gmail.com

تمہید: خدانے انسانوں تک اپنی ہدایت کو پہنچانے اور اس کو برت کر دکھانے کے لئے انسانوں ہی میں سے اپنے برگزیدہ بندوں کا انتخاب کیا، حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت محمد ﷺ تک ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر انسانوں کی رہنمائی کے لئے اللہ کی طرف سے منتخب کئے گئے، حضرت محمد ﷺ پر دین کا اتمام کر دیا گیا اور آپ کو خاتم النبیین بنایا گیا، اس سے پہلے جو انبیاء آئے وہ کسی خاص قوم یا علاقے کے لئے تھے، لیکن رسول اکرم ﷺ کی بعثت تمام انسانوں کے لئے اور قیامت تک آنے والے تمام زمانوں کے لئے ہوئی، آپ پر اتاری ہوئی کتاب قرآن مجید بھی اللہ کی آخری کتاب اور زندگی گزارنے کے لئے ایک مکمل ہدایت نامہ ہے، آپ ﷺ نے اپنی تیئس (۲۳) سالہ نبوی زندگی میں اس کتاب کی روشنی میں ایک مکمل اسلامی زندگی گزار کر زندگی کے ہر شعبے اور ہر فرد کے لئے مکمل اور جامع اسوہ چھوڑا ہے، قرآن اللہ کے رسول ﷺ کو بنی نوع انسانیت کے لئے رحمۃ للعالمین قرار دیتا ہے، ﴿وما أرسلناک إلا رحمة للعالمین﴾ (أنبیاء:۱۰۷) پھر آپ کو پوری انسانیت کے لئے قابل تقلید بنا کر پیش کرتے ہوئے بہترین نمونہ قرار دیتا ہے: ﴿لقد کان لکم في رسول اللّٰہ أسوة حسنة﴾ (سورہ احزاب:۲۱) آپ ﷺ کی حدیث ہے: ''سب سے بہترین کلام اللہ کی کتاب ہے اور سب سے بہتر طریقہ زندگی محمد ﷺ کا طریقہ ہے'' (مسلم) نبی کریم ﷺ کی زندگی مختلف حیثیتوں سے ہر انسان کے لئے ایک بہترین نمونہ ہے، آپ کا لایا ہوا دین انسانوں کے خالق و مالک کا عطا کردہ ہے، اسی لئے وہی زندگی گزارنے کا سیدھا اور سچا راستہ ہے، لہذا مسائل و مصائب کی ماری، اضطراب اور بے چینی میں مبتلا دنیا کو اگر کہیں پناہ مل سکتی ہے تو وہ صرف محسن انسانیت کے اسوہ ہی میں مل سکتی ہے۔

امن وسلامتی کا مفہوم قرآن وحدیث کی روشنی میں: جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ ذاتِ نبوی حیاتِ انسانی کے ہر گوشے کے لئے اسوہ اور نمونہ ہے، تو لامحالہ ذاتِ نبوی میں اور آپ کے لائے ہوئے احکام وتعلیمات میں امن وسلامتی سے متعلق بھی احکام ہوں گے، اور آپ ﷺ نے عملی زندگی میں بھی اس کو برتا ہوگا، ذیل میں ''امن اور اسلامی تعلیمات'' نامی ایک مضمون کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے جو ماہنامہ ''افکار ملی'' میں ستمبر ۲۰۱۰ء کی خصوصی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔

''شریعت میں دو اصطلاحی لفظ ہیں، اسلام اور ایمان، ایک کا مادہ ''سِلْم'' ہے اور دوسرے کا ''اَمْن'' اور ان دونوں کے ایک ہی معنی ہیں، یعنی 'امن وسلامتی'، اسی طرح مسلمانوں کے تعارف کے لئے بھی دو لفظ استعمال کئے جاتے ہیں: 'مسلم' اور 'مومن' جو پہلے دو لفظوں ہی سے مشتق ہیں، اور ان کے معنی بھی تقریباً وہی ہوتے ہیں، یعنی امن وسلامتی ہی کے دوسرے نام ہیں اسلام اور ایمان، اور اسی طرح جو شخص خود اپنی اور دوسروں کی سلامتی چاہتا ہے، وہ مسلمان ہے اور جو خود اپنے لئے اور دوسروں کے لئے

امن چاہتا ہے وہ مومن ہے۔

(جس مذہب کی لفظی بنیاد تک امن وسلامتی پر مبنی ہو اور جس کے ماننے والے کو امن وسلامتی کا علمبردار کہا جائے غور کیجئے کہ امن وسلامتی کو اس کی تعلیمات اور احکام میں کتنا دخل ہوگا!!!)۔

خطبہ حجۃ الوداع میں آپ ﷺ نے مسلمان اور مومن کی وضاحت اس طرح فرمائی تھی۔

۱) مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے لوگ محفوظ رہیں۔

۲) مؤمن وہ ہے جس سے دوسرے لوگوں کا جان ومال عافیت میں رہے۔

پر امن بقائے باہم (Coexistance) کے سلسلے میں قرآن کی ہدایات نہایت صاف اور واضح ہیں، چند تعلیمات درج ذیل ہیں:۔

۱-﴿لا إكراه في الدين قد تبين الرشد من الغي﴾ (البقرۃ: ۲۵۶) دین میں کسی طرح کی کوئی زبردستی نہیں، اب ہدایت گمراہی سے واضح ہوچکی ہے۔

۲- ﴿ولا تسبوا الذين يدعون من دون الله فيسبوا الله عدوا بغير علم﴾ (الأنعام:۱۰۸) جو لوگ اللہ پر ایمان نہیں رکھتے ان کے خداؤں کو برا مت کہو، نہیں تو وہ بھی نادانی اور دشمنی میں اللہ کو برا کہیں گے۔

اس سے بڑھ کر پر امن بقائے باہم (Coexistance) کی تعلیمات اور کیا ہوسکتی ہیں؟ مذکورہ آیات کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسلام کی تبلیغ میں کسی قسم کی کوئی زبردستی جائز نہیں۔

۳-﴿ادع إلى سبيل ربك بالحكمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتي هي أحسن﴾ (النحل:۱۲۵) اپنے رب کے راستے کی طرف لوگوں کو بلاؤ انتہائی دانشمندی اور ہمدردی کے ساتھ اور ان کے ساتھ بہتر طریقے پر مباحثہ (Dialogue) کرو۔

پہلی دوسری آیت میں دنیا کے تمام انسانوں کو ان مشترک باتوں اور ان مسلّمات کی دعوت دی جارہی ہے جن کے قبول کرنے میں کسی کو کوئی عار نہیں جب کہ تیسری آیت میں مسلمانوں کو تلقین کی جارہی ہے کہ وہ اپنی بات دوسروں کے سامنے نہایت حکمت اور موعظت کے ساتھ رکھیں، یعنی دانشمندی اور ہمدردی کے ساتھ۔

رہی بات دہشت گردی (Terrorism) کی تو یہ از اول تا آخر اسلامی اور قرآنی تعلیمات کے خلاف ہے، قرآن میں ہے۔

۱ – ﴿من قتل نفسا بغير نفس أو فساد في الأرض فكأنما قتل الناس جميعا ومن أحياها فكأنما أحيا الناس جميعا﴾ (المائدۃ: ۳۲) جس نے کسی انسان کو بلاوجہ قتل کیا یا دنیا میں فساد پیدا کیا تو گویا اس نے ساری انسانیت کو قتل کر ڈالا، اور جس نے ایک انسان کی زندگی بچالی گویا اس نے پوری انسانیت کی زندگی بچالی۔

۲- ﴿ولا تبغ الفساد في الأرض إن الله لا يحب المفسدين﴾ (القصص:۷۷) اور زمین میں فساد مت پھیلاؤ کیونکہ اللہ فساد پھیلانے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔

۳- ﴿تعالوا إلى كلمة سواء بيننا وبينكم ألا نعبد إلا الله ولا نشرك به شيئاً ولا يتخذ بعضنا بعضاً أربابا من دون الله﴾ (آل عمران: ۶۴) آؤ ہم سب ایک ایسے کلمہ پر اتفاق کرلیں جو ہمارے درمیان برابر ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم اللہ کے علاوہ کسی اور کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائیں اور اللہ کے بجائے ہم خود آپس ہی میں ایک دوسرے کو معبود نہ بنالیں۔

ایسا کیسے ہوسکتا ہے کہ ماں اپنے بیٹے کو اگر چہ وہ باغی اور سرکش ہو اپنی طرف بلائے اور اس کی آنکھوں میں اس کے لئے محبت اور پیار نہ ہو، اسی طرح ایسا کیسے ہوسکتا ہے کہ اسلام دوسروں کو اپنی طرف بلائے اور اس کی نگاہوں میں ان کے لئے پیار نہ ہو، ہمدردی نہ ہو، اس کے لہجے میں محبت کے جذبات کی گرمی نہ ہو اور انسیت واپنائیت کا شائبہ نہ ہو۔

ذرا درج ذیل تعلیمات نبوی پر ایک نظر ڈالئے:۔

۱- رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اے

میرے بندو! میں نے اپنے اوپر ظلم کو حرام ٹھہرایا ہے، تم بھی آپس میں ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو۔ (مسلم رواہ ابوذر رضی اللہ عنہ)

۲- رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن اللہ تبارک وتعالیٰ سب سے پہلے لوگوں کے جن معاملات کا فیصلہ فرمائے گا وہ قتل کے معاملات ہوں گے۔ (بخاری ومسلم، رواہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ)

۳- تمام مخلوق اللہ کا کنبہ ہے، اور اس کو اپنی مخلوق میں سب سے زیادہ محبوب وہ شخص ہے جو اس کے کنبہ کے ساتھ بہترین سلوک کرتا ہے۔ (البیھقي في شعب الإیمان: ۴۶/۶، رقم الحدیث:۷۴۴۴) (ماہنامہ افکار ملی، ستمبر ۲۰۱۰ء)

حضور ﷺ کی مختلف زمانوں میں امن کی کوششیں: ایک جائزہ:

مذکورہ بالا تعلیمات سے یہ حقیقت آشکارا ہوگئی کہ مذہب اسلام کی تعلیمات کا کتنا بڑا حصہ امن وسلامتی کی تعلیمات اور اس کے متعلق احکامات سے وابستہ ہے، لیکن اگر صرف احکامات وتعلیمات واصول وضوابط اور قوانین سے متعلق کتابیں ہدایت واتباع کے لئے کافی ہوتیں تو اللہ ہدایت کے لئے نبیوں کو نہ بھیجتا، لیکن خلاقِ علیم انسان کی فطرت سے واقف تھا کہ جب تک عملی نمونہ نہ ہو وہ کسی کے سامنے جھکتا نہیں ہے، اسی بناء پر اگر آپ غور کریں تو بہت سے مذاہب ہیں جن کی کتابوں کی تعلیمات ان کے میدان عمل سے ذرا برابر بھی میل نہیں کھاتیں، مثلاً عیسائیت جن کی تعلیمات میں عفو وصفح کا بہت اونچا مقام ہے، لیکن اس مذہب کے متبعین میں بہت کم لوگ اس پر گام زن ہیں، اور یہ چیز اس مذہب کی مقبولیت میں مانع بن جاتی ہے، لیکن چوں کہ دینِ اسلام ابدی وسرمدی دین ہے، لہٰذا اس کے متعدد ولا تعداد امتیازات میں ایک یہ بھی ہے کہ جس طرح اس مذہب میں قانون کے لئے ایک کتاب قرآن ہے جو افضل کتب ہے اسی طرح اس کو عملاً ثابت کرنے کے لئے حضور ﷺ کی ذات مبارکہ کی مکمل زندگی ہے، جو کہ افضلِ خلائق ہیں، اور حضور ﷺ کی مکمل زندگی تاریخ وسیرت اور حدیث کی کتابوں میں موجود ومحفوظ ہے، اس سلسلہ میں حضور ﷺ کی زندگی کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱- زمانہ جاہلیت میں امن کی کوششیں۔

۲- مکی زندگی، بعد نبوت کا پرامن ماحول۔

۳- مدنی زندگی اور امن وسلامتی کے چند نمونے۔

۱- زمانہ جاھلیت میں امن کی کوشش

۱- نبوت سے پہلے کا ایک اہم واقعہ یہ ہے کہ کچھ لوگ عبداللہ بن جُدعان کے گھر میں اس مقصد سے جمع ہوئے کہ سب لوگ مل کر ظالم کو ظلم سے روکنے کی کوشش کریں اور مظلوم کی مدد کریں، اس معاہدہ کو "حلف الفضول" کہتے ہیں آپ ﷺ بھی اس میں شریک ہوئے، آپ کو یہ معاہدہ اس قدر پسند تھا کہ آپ ﷺ نبوت کے بعد بھی فرماتے تھے کہ اگر اب بھی مجھے ایسے معاہدہ کی طرف دعوت دی جائے تو میں اسے قبول کروں گا، مذکورہ واقعہ اور واقعہ پر بعد نبوت تبصرہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ امن وسلامتی کی محبت آپ کے اندر فطری وطبعی طور پر ودیعت کردی گئی تھی، جب کہ یہ واقعہ بعدِ نبوت پیش آئے امن وسلامتی کے واقعات کے سامنے عشر عشیر کی بھی حیثیت نہیں رکھتا، اس کے باوجود حضور ﷺ نے اس کی مدح کی۔ (تلخیص ماخوذ از: زادالمعاد ودیگر کتب سیرت)

۲- جب عمر مبارک ۳۵ رسال کی ہوئی تو خانہ کعبہ میں بارش کی وجہ سے شگاف پڑ جانے کے سبب کعبۃ اللہ کی تعمیر نو انجام پائی، اس میں جب حجر اسود کو اپنی جگہ رکھنے کا موقع آیا تو مختلف قبائل کے درمیان کشمکش شروع ہوئی، اور قتل وقتال کا اندیشہ پیدا ہوگیا، ایسے موقع پر مکہ کے ایک بزرگ نے تجویز پیش کی کہ کل جو شخص سب سے پہلے کعبۃ اللہ میں آئے وہ حجر اسود کو اپنی جگہ رکھے، کل سب سے پہلے کعبہ میں آنے والی شخصیت آپ ﷺ کی تھی، چنانچہ آپ ﷺ نے ایک چادر منگوائی، اس کے وسط میں پتھر رکھا، ہر ہر قبیلے سے ایک ایک نمائندہ طلب کیا، اور ان سب سے کہا کہ وہ چادر کے کنارے پکڑ کر حجر اسود کو اس جگہ تک لے جائیں، جہاں اسے نصب کیا جانا ہے پھر جب وہاں پہنچے تو اپنے دست مبارک سے پتھر کو اس کی جگہ نصب فرمادیا، اس طرح ایک بڑے فتنہ کا سدباب ہوا، اور امن کی فضا قائم رہی۔

مکہ کے ماحول کو دیکھ کر یہ کہنا بجا ہوگا کہ اگر حضورﷺ کے علاوہ اور کوئی شخص ہوتا تو پہلے تو لوگ اسے تسلیم ہی نہ کرتے، وہ تو حضورﷺ کی ذات تھی جن کی صادقیت وامانت مسلم تھی، اور اگر تسلیم کر بھی لیتے تو وہ ترکیب جو حضورﷺ نے اپنائی کہ کسی قبیلہ کو شکایت نہ رہی اور معاملہ رفع دفع ہوگیا، اس کے ذہن میں نہ آتی، اور کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرتا جو اختلاف کا سبب بن جاتا، اگر حضورﷺ چاہتے تو اپنے قبیلے کے لئے اس شرف کو خاص کر دیتے لیکن امن کی فضا کو باقی رکھنے کے لئے آپ نے ایسا نہ کیا۔

۳- اسی طرح جب حضرت خدیجہؓ نے زید بن حارثہ کو حضورﷺ کی خدمت میں دے دیا، جو یمن کے ایک قبیلے کے سردار حارثہ بن شرحبیل کے صاحبزادے تھے، جنھیں ڈاکوؤں نے زبردستی آٹھ سال کی عمر میں اغوا کر کے بیچ دیا تھا، پھر جب ان کے والد و چچا تلاش کرتے ہوئے حضورﷺ کے پاس پہنچے تو حضور نے امن کی بحالی کے لئے جو ترکیب اختیار کی وہ واقعی قابل تقلید ہے، کہ حضورﷺ نے خود زید بن حارثہ کو اختیار دے دیا کہ جس کو چاہے اختیار کرے، اور انہوں نے حضورﷺ کی صحبت کو ترجیح دی، اگر حضورﷺ والد و چچا کو دینے سے صاف انکار کر دیتے اور اس کا حق بھی تھا تو وہ زمانہ جس میں بات بات پر سالوں جنگ چلتی، گھوڑے کے پانی پلانے میں سبقت کرنا جنگ کا سبب بن جاتا تو کوئی بعید نہ تھا کہ ان کے والد بھی غصے میں آجاتے وہ بھی سردار قبیلہ تھے اور پھر یہ واقعہ جنگ کا سبب بن جاتا۔

۴- قبل از نبوت حضورﷺ کی زندگی میں امن کے نمونوں میں ایک نمونہ یہ بھی ہے کہ جب حضورﷺ ۱۴-۱۵ سال کے تھے تو حرب الفجار نامی مشہور جنگ پیش آئی، جس کو آپ نے دیکھا اور ناپسند کیا، چونکہ آپ اس جنگ میں شریک تھے اور چھوٹے تھے، اس کے باوجود امن پسند طبیعت نے یہ گوارا نہ کیا کہ اپنے ہتھیار سے بذات خود کسی پر وار کریں، اسی بنا پر چونکہ خاندانی جنگ تھی اس لئے شریک تو ہوئے لیکن صرف یہ کرتے کہ تیر اٹھا کر چچا کو دیتے رہے خود حملہ نہ کیا، اور بعد میں اس کو بھی ناپسند کیا، اور زندگی بھر سوائے ایک دو واقعہ کے بذات خود کسی پر وار نہ کیا۔

۲- مکی زندگی۔ بعد نبوت کا پر امن ماحول:

مذکورہ واقعات زمانہ قبل از نبوت کے تھے جو معاشرتی سطح کے تھے، لیکن جب حضورﷺ کو بعثت ملی تو اس کے بعد بھی آپ کے امن پسندی کے نمونے ظاہر ہوتے رہے بلکہ اس میں اضافہ ہوا، قبل اس کے کہ ان واقعات پر روشنی ڈالی جائے یہ جاننا ضروری ہے کہ حضورﷺ نے بعد نبوت مکی زندگی میں جو امن کی بقا کی کوشش کی وہ عدیم المثال ہے، اور اس کا سبب یہ نہیں کہ حضورﷺ کچھ نہ کر سکتے تھے اس لئے صبر کر جاتے، بلکہ اگر دیکھا جائے تو حضورﷺ منٹوں بلکہ سکنڈوں میں مخالفین کے خلاف کارروائی کر سکتے تھے، دنیوی اعتبار سے بعد نبوت اگرچہ اکثر لوگوں نے حمایت چھوڑ دی تھی لیکن پھر بھی آپ کا قبیلہ آپ کے ساتھ تھا، آپ چاہتے تو مدد کے لئے ان کو آواز دیتے پھر جنگ چھڑ جاتی، اور اخروی اعتبار سے آپ کا تعلق تو آسمانی دنیا سے اور اس عالم و کائنات کے خالق سے تھا اگر آپ چاہتے تو ایک بددعا میں پوری قوم کو ہلاک کر دیتے، جیسا کہ بعض سابقہ انبیاء کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے، لیکن امن پسند طبیعت نے اس کو گوارا نہیں کیا۔

تو آیئے اس دور کے واقعات پر سرسری نظر کی جائے:

۱- نبوت کے ملنے کے بعد سب سے پہلے جب آپ نے کوہِ صفا پر چڑھ کر لوگوں کو دعوت دی، تو جواب میں ابولہب نے جب کہا کہ غارت ہو جاؤ کیا یہی بات تھی جس کے لئے تم نے ہم سب کو یہاں اکٹھا کر لیا تھا، دعوت کا یہ پہلا قدم تھا جس پر مخالف کے شور و واویلا کرنے پر حضورﷺ نے مکمل سکوت کیا، اگر اس موقعے پر ایک لفظ بھی کہتے تو پھر معاملہ طول اختیار کر جاتا، اور امن کی فضا مکدر ہو جاتی۔

۲- اسی دعوت عام کی مہم کا دوسرا قدم جو حضورﷺ نے اٹھایا وہ یہ ہے کہ آپﷺ نے تمام خاندان عبدالمطلب کو کھانے پر بلوایا، فراغت طعام کے بعد آپ نے اپنے تعاون کی تشکیل کی اور جب حضرت علی نے کھڑے ہو کر اپنے تعاون کا اعلان کیا تو تمام سرداران قہقہہ لگانے لگے، لیکن پھر بھی حضور نے سکوت کیا۔

۳-اسی طرح جب ایک مرتبہ نماز پڑھتے ہوئے سعد بن ابی وقاص کو ایک مشرک نے زخمی کر دیا جو کہ خون کی سب سے پہلی دھار تھی جو مکہ کی خاک پر خدا کی راہ میں بہی، اس پر بھی کوئی ردعمل نہ کیا گیا۔

۴- پھر جب ایک مرتبہ حضورﷺ نے کعبہ میں کھڑے ہوکر اس دعوت کا اعلان کیا تو مشرکین نے آپ کو برا بھلا کہا کسی نے شاعر تو کسی نے کاہن کہا، لیکن حضورﷺ اپنی دعوت دیتے رہے، اور بذات خود کوئی جواب نہ دیا، بلکہ اللہ تعالی نے معجزانہ انداز میں ان باتوں کی تردید کی۔

۵- نیز حضورﷺ کو ستانے کے لئے انتشار انگیزیاں، کٹ حجتیاں، دلائل، استہزاء، غنڈہ گردی ہر ممکنہ صورت کو اختیار کیا گیا، محلّہ کے پڑوسی جو بڑے بڑے سردار تھے آپ کے راستے میں کانٹے بچھاتے، نماز پڑھتے وقت شور مچاتے، اوجھڑیاں لاکر ڈالتے، گلا گھونٹتے لیکن ان سب پر صبر کیا۔

۶- یہاں تک کہ مشرکوں نے آپ کو لاچار و مجبور کرنے کے لئے بنو ہاشم کو شعب ابی طالب میں قید کر دیا اس پر بھی صبر سے کام لیا۔

۷- پھر جب مکہ سے دلبرداشتہ ہوکر طائف گئے، تو وہاں جو برتاؤ کیا گیا اگر آپ چاہتے تو فرشتوں کی پیش کردہ تجویز پر عمل کر کے پورے طائف کے امن کو خاکستر کر دیتے لیکن امن کی بحالی کے لئے ایک لفظ ان کے خلاف نہ کہا۔ (محسن انسانیت ص:۲۱۰)

۸-اسی طرح امن کی بحالی میں شب ہجرت بھی بہت ہی واضح و بین دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مشرکین مکہ کے حصار سے حضورﷺ کو بحفاظت نکال دیا اگر حضورﷺ چاہتے تو ان کے لئے بددعا کر دیتے یا اپنے خاندان کی دہائی دیتے، پھر جنگ کا سلسلہ شروع ہوجاتا لیکن آپ اور آپ کے صحابہ نے سب کچھ برداشت کیا اور گھر بار وطن دولت سب کو چھوڑنا گوارا کر لیا۔

مکی زندگی (بعد نبوت) کے اس طویل دور میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ملتا جس میں حضورﷺ یا آپ کے صحابہ کی طرف سے کوئی ایسا اقدام کیا گیا ہو جو امن کی فضا کو مکدر کرتا، حالانکہ اخیر زمانہ میں تو حضرت عمر و حضرت حمزہ جیسے صاحب وقار وذی اقتدار حضرات مشرف باسلام ہو چکے تھے جو حضورﷺ کے ایک اشارے کے منتظر تھے، لیکن خدا کا حکم تھا اور حضورﷺ کی امن پسند طبیعت کہ چاہتے تھے کہ مسئلہ پر امن طریقے سے حل ہوجائے، اور اسی امن کی بحالی کے لئے ہجرت کو ترجیح دی، اس سے زیادہ امن کی مثال اور کون سی ذات اور کون سی جماعت پیش کر سکتی ہے، وہ بھی اس زمانہ میں جو کہ بات بات پر جنگ اور لڑائی کا زمانہ تھا، لیکن اگر یہ طریقہ اختیار نہ کیا جاتا تو مقصد میں کامیابی ناممکن تھی۔

مدنی زندگی اور امن وسلامتی کے چند نمونے

نمونے: یوں تو حضورﷺ کی پوری زندگی ہی امن وسلامتی کے نمونوں سے بھرپور ہے، لیکن مدنی زندگی میں امن وسلامتی کا گوشہ نہایت ہی وسیع ہوگیا، مکی زندگی میں اپنی قوم سے واسطہ تھا تو مدنی زندگی میں آپ کے تعلقات عالمی ہوگئے، مختصر عرصے میں چاروں طرف سے دشمنوں کے نرغے میں گھرے ہونے کے باوجود جس طرح امن کو بحال رکھتے ہوئے اپنے مقصد اصلی کو پورا کیا اس پر دنیا حیران ہے، ایک طرف مکہ کے مشرکین تھے دوسری طرف داخلی منافقین، تیسری طرف یہود، چوتھے مخالف نصاری کے بعض قبائل اور پھر آخر میں وقت کی دو طاقتور سلطنتوں کی مخالفت، ان سب کے درمیان ایک پر امن نظام کو قائم کرنا ایک ایسا کارنامہ ہے جو آپ سے پہلے نہ کسی نے انجام دیا اور نہ آپ کے بعد کوئی اس کے بارے میں سوچ سکتا ہے، چونکہ مدنی زندگی نہایت ہی وسیع اور لامحدود ہے اس بنا پر الگ الگ مختلف گوشوں سے جائزہ لینا زیادہ مناسب ہوگا۔

۱-**ذاتی زندگی:** اس سطح پر یہ جان لینا کافی ہوگا کہ آپ کی پوری زندگی اور خاص طور پر مدنی دور میں کسی کو آپ سے یا آپ کو کسی سے ذاتی دشمنی یا عناد نہ تھا، آپ اپنی ذات کے اعتبار سے مجسم رحمت تھے، قرآن میں ہے: ”**فبما رحمة من الله لنت لهم ولو كنت فظا غليظ القلب لا نفضوا من حولك**“ (سورہ آل عمران) یہ چیز امن کے قیام میں بہت معاون ثابت ہوتی ہے۔

۲-**خانگی زندگی:** خانگی معاملات میں ازواج

مطہرات کے درمیان مساوات، غلاموں سے ملاطفت، بدوؤں کے جاہلانہ رویوں پر عفوودرگذر اور صحابہ کی صحیح تربیت کے ذریعے حضورﷺ نے جو پرامن فضا قائم کی یہ آپ ہی کا حصہ تھا، حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ میں دس سال حضورﷺ کی خدمت میں رہا، کبھی آپ نے اف تک نہ کیا اور نہ کسی کام کے بارے میں کہا کہ یہ تم نے کیوں کیا، اور یہ کیوں نہیں کیا؟ اسی طرح ایک بدو آکر چادر سے آپ کی گردن کھینچنے لگا تو آپ نے کچھ نہ کہا۔

۳- معاشرتی سطح پر بطور نمونہ صرف اخوت کی اس نادر و نایاب مثال کا ذکر کافی ہے جس کی نظیر ملنا مشکل ہی نہیں نا ممکن ہے، جب مہاجرین ہجرت کر کے سب کچھ چھوڑ کر مدینہ آئے تو سب سے بڑا مسئلہ معیشت کا تھا، جس کا حل اللہ کے رسولﷺ نے انصار و مہاجرین کے درمیان اخوت کے ذریعے نکالا، اگر اس میں تھوڑی بھی تاخیر ہوتی تو یہ چیز بہت سے مفاسد کے وجود کا ذریعہ بن جاتی، اس سلسلے میں آپ کی وہ حدیث امن کے قیام کی اعلیٰ مثال ہے جس میں آپﷺ نے فرمایا: ’’ **لا فضل لعربي على عجمي ولا لعجمي على عربي ولا لأسود على أحمر ولا لأحمر على أسود إلا بالتقويٰ** ‘‘ کسی عربی کو عجمی پر اور کسی کالے کو گورے پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقوی کی بنیاد پر۔ (الحدیث)

قیام امن کے لئے معاشرتی زندگی کا ایک اہم اصول:۔ اسلامی نقطۂ نظر سے معاشرے کے استحکام اور امن کے قیام کا دارومدار اس پر ہے کہ معاشرے کے افراد خیر کے لئے ایک دوسرے کے معاون بنیں، قرآن میں اس اصول کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔ ’’ **تعاونوا على البر والتقويٰ ولا تعاونوا على الإثم والعدوان** ‘‘ نیکی اور پرہیزگاری میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو اور گناہ و زیادتی میں باہم کسی کی مدد نہ کرو۔

٤- ملکی سطح پر مدنی زندگی میں امن کے لئے جو کوششیں حضورﷺ نے کیں ان میں سب سے بہتر کوشش یہ تھی کہ آپ نے مدینہ آتے ہی وہاں کے یہود سے عہد کیا کہ ہم آپس میں امن و امان کے ساتھ رہیں گے، اگر کوئی خارجی حملہ ہوگا تو ہم سب مل کر اس کا دفاع کریں گے، اسی طرح کا معاہدہ حضورﷺ نے آس پاس کے دیگر قبائل سے بھی کیا۔

۵- عالمی سطح پر حضورﷺ نے جو کوشش کی ان میں حضورﷺ کے وہ خطوط ہیں جو آپ نے دنیا کے مختلف بادشاہوں کو امن کی تعلیمات سے متعلق بھیجے اور ان کو ایک کلمے کی دعوت دی اور امن و سلامتی کی طرف بلایا۔

۶- اس سلسلے میں کوئی یہ اعتراض کر سکتا ہے کہ جب حضورﷺ کی پوری زندگی امن و سلامتی کی دعوت پر قائم تھی تو پھر غزوات و سرایا کیونکر وجود میں آئے جس میں قتل ہوا، بچے یتیم ہوئے، عورتیں بیوہ ہوئیں۔

بظاہر یہ اعتراض صحیح بھی معلوم ہوتا ہے، لیکن جب کہ ایسا شخص کرے جو سیرت سے نابلد اور تاریخ سے لاعلم ہو، اگر دور بین نظروں سے دیکھا جائے، تو جتنے غزوے ہوئے ان سب کی بناء مجبوری ہے یا امن و سلامتی کی راہ کی ہمواری۔

آیئے چند غزوات کے پس منظر پر غور کریں تا کہ حقیقت واشگاف ہو جائے:

۱- غزوۂ بدر: جب مسلمان مدینہ جا کر امن و امان سے رہنے کی کوشش کرنے لگے اور تمام ممکنہ صورتیں اختیار کیں، تو مشرکین مکہ کے دلوں کا سکون چھن گیا اور انھوں نے مسلمانوں کو پریشان کرنا شروع کر دیا، ایک تو مسلمان معاشی اعتبار سے تنگ تھے، جو بھی کچھ قوت ملی ہی تھی کہ ان مشرکین نے پھر انتشار انگیزی شروع کر دی، یہاں تک کہ بعض مرتبہ چھوٹے چھوٹے گروہ کی شکل میں مدینہ کے قریب آتے اور حملہ کر کے چلے جاتے، جس سے امن کا ماحول فساد میں بدل رہا تھا، جس کی روک تھام ضروری تھی، اسی دوران میں خبر ملی کہ ایک قافلہ قریش کا مع ساز و سامان کے آنے والا ہے، تو حضورﷺ نے محض دھمکانے کے لئے اور ان کو متنبہ کرنے کے لئے کچھ لوگوں کو بھیجا، جس کا مقصد جنگ ہر گز نہ تھا بلکہ صرف مخبری یا زیادہ سے زیادہ اس کو روکنا و متنبہ کرنا تھا، لیکن خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ جھڑپ ہوگئی اور مشرکین کا ایک آدمی مارا گیا، جب یہ خبر مشرکین مکہ کو پہنچی تو باوجود قافلہ کے بچ نکلنے کے

وہ واپس نہ گئے بلکہ بدر کے مقام پر جمع ہوگئے، پھر مجبوراً مسلمانوں کو بھی نکلنا پڑا، اور یہ غزوہ پیش آیا۔

۲-غزوۂ احد اس میں تو پورا ہاتھ مشرکین کا تھا جو مدینہ پر حملہ کرنے کے لئے آئے تھے لیکن حضور ﷺ اور صحابہ نے مشورہ کے بعد شہر سے باہر نکل کر مقابلے کو مناسب سمجھا اور یہ غزوہ پیش آیا، اسی جنگ میں حضور کے دندانِ مبارک شہید ہوئے، لیکن آپ نے صرف اتنا کہا: ''اللّٰھم اھد قومي فإنھم لا یعلمون''۔ اے اللہ میری قوم کو ہدایت دے، بے شک وہ نہیں جانتے۔

۳-**غزوۂ خندق**: اس میں بھی مشرکین نے خود مدینے کا حصار کیا اور جنگ کی۔

۴-**صلح حدیبیہ**: امن وشانتی کی سب سے واضح مثال صلح حدیبیہ ہے جب مہاجرین کو ہجرت کئے ایک مدت ہوگئی تو ان کے دل میں بار بار یہ خیال پیدا ہوتا کہ اپنے خاندان اپنے بیوی بچوں سے ملاقات کریں، بیت اللہ کی زیارت سے آنکھوں کو ٹھنڈا کریں، اسی ارادے سے حضور ﷺ صحابہ کی ایک جماعت کو لے کر جانب مکہ روانہ ہوئے، اور مشرکین کو غلط گمان نہ ہو اس لئے اونٹوں کو قلائد لگوائے، ہتھیار بھی کم سے کم لئے، اور سیدھے مکہ نہ گئے بلکہ مقام حدیبیہ پر قیام کیا اور اطلاع کے لئے حضرت عثمان کو بھیجا، پھر جب قریش کی طرف سے سھیل بن عمرو امن کا پیغام لے کر آئے، تو ان کی ہر شرط قبول کی، اور ادب کر صلح کی کہ بعض صحابہ تک اس پر دل برداشتہ ہوگئے اور پوچھنے لگے کہ کیا ہم حق پر نہیں؟ لیکن حضور ﷺ نے صلح کو مع کل شرائط قبول کیا، اگر آپ چاہتے تو زبردستی اپنی طاقت کے بل بوتے پر عمرہ کر لیتے، سابقہ جنگوں سے اہل مکہ پر رعب طاری ہو چکا تھا، ان کے بہت سے سردار مارے جا چکے تھے، اور مسلمانوں کی تعداد بھی بہت زیادہ تھی لیکن بغیر ادائیگی عمرہ کے واپس چلے گئے۔

۵-**قبائل یھود کا اخراج**: جب حضور نے یہودیوں سے معاہدہ کر لیا تو یہودیوں کو چاہئے تھا کہ وہ اس معاہدہ کا خیال رکھتے اور اس کو پورا کرتے، اور اگر تعاون نہ کرتے تو عداوت کا اظہار بھی نہ کرتے لیکن ان خبیث طینت یہودیوں کی طبیعت کو اسلام کی ترقی دیکھ کر کہاں چین آتا، جب بھی موقع ملتا غداری اور نقضِ عہد کرتے جس کی بنا پر ایک ایک کر کے ان کو جلاوطن کر دیا گیا تا کہ مدینہ کی پر امن فضا مسموم نہ ہو، اگر آپ چاہتے تو ان کے ہر قبیلہ کو قتل کرا دیتے البتہ ایک قبیلے کے بالغ مردوں کو قتل کیا اور یہ قتل خود یہودیوں کے قانون کے مطابق تھا، لیکن رحم وکرم کی داد دیجئے کہ معاف کیا پھر سامان لے جانے کی بھی اجازت دی۔

۶-**غزوۂ خیبر**: جب یہودیوں کو مدینہ سے جلاوطن کر دیا گیا تو ان میں سے بہت سوں نے مقام خیبر میں اپنی بستیاں آباد کیں اور پھر وہاں سے انھوں نے انتشار انگیزیاں اور فساد شروع کر دیا جس کی سرکوبی اور بقائے امن کے لئے ان کی خبر لینا ضروری تھا، اسی لئے اس غزوہ کی ضرورت پیش آئی۔

۷-**فتح مکہ**: پیچھے گزر چکا ہے کہ صلح حدیبیہ میں حضور ﷺ نے ان کی تمام شرائط کو منظور کر لیا تھا ان میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ جو قبیلہ جس فریق کا چاہے ساتھ دے، اس سلسلے میں بنوخزاعہ نے مسلمانوں کا ساتھ دیا، لیکن مشرکین مکہ نے کچھ عرصے میں معاہدہ کی پامالی کرتے ہوئے بنوخزاعہ کا قتل عام کیا اور نقض عہد کر دیا، اس بنا پر مسلمانوں پر ضروری ہوگیا کہ وہ اپنے حلیف کا بدلہ لیں اور ان کی مدد کریں اور اس کی یہی صورت تھی کہ مکہ جا کر مسئلہ کو حل کیا جائے، اسی ضرورت کے پیش نظر یہ واقعہ وجود میں آیا، اور اسی واقعے میں آپ نے ''لاتثریب علیکم الیوم اذھبوا أنتم الطلقاء'' (آج کے دن تم پر کوئی ملامت نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو) کا مژدہ سنا کر امن کے قیام کی نادر مثال پیش کی۔

یہ تو تھے کچھ غزوات کے پس منظر، اس کے علاوہ اگر غزوات کی اسلامی تعلیمات پر نظر ڈالی جائے تو حضور ﷺ نے بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کو مارنے سے منع فرمایا، اسی طرح جو اطاعت قبول کر لے اس کو بھی معاف کرنے کا حکم دیا، نیز بدر کی جنگ کے بعد قیدیوں سے حسن سلوک کر کے فتح مکہ کے بعد عام امن وامان کا اعلان کر کے، یہودیوں کی سازشوں کے بعد جلاوطنی پر اکتفا کر کے، خیبر کی فتح کے بعد کاشت کے لئے ان کو زمین دے کر امن وامان اور سلامتی وشانتی کی جو مثالیں قائم کی

ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔

یہ بھی غور کرنے کی بات ہے کہ اتنے غزوات کے باوجود دونوں کے مقتولین کی جو تعداد ہے اس سے کہیں زیادہ بڑی تعداد بعد کی امن پسندی کا دعویٰ کرنے والوں کے درمیان ہوئی جنگوں میں سے ایک جنگ میں مقتول ہوئی، انھی سب مساعی جمیلہ کا نتیجہ تھا کہ حضور ﷺ نے محض چند سالوں کے عرصے میں جو کارنامہ انجام دیا ان کے انجام دینے سے پوری کی پوری جماعت ایک لمبے عرصے میں بھی عاجز و بے بس ہے، اس لئے کہ آپ تو رحمۃ للعالمین ہیں۔

تربیت یافتہ صحابہ اور امن عالم

حضور ﷺ کی بہت ساری خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے بعد صحابہ کی ایسی جماعت چھوڑی جو ایک عرصے تک سو فیصد تعلیمات نبوی خاص طور پر تعلیمات امن پر گامزن رہی، لہٰذا ضروری ہے کہ اس جماعت کے بعض اہم نمونوں کا ذکر باختصار کر دیا جائے، یوں تو ہر صحابی امن کا پیغامبر اور سلامتی کا خوگر تھا، ہر ایک کا ذکر دشوار ہے لہٰذا چند پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔

۱-**حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ** جب حضور ﷺ کا انتقال پر ملال ہوا تو ہر مسلمان فطری طور پر ایک غم واندوہ کی کیفیت کا شکار ہو گیا، یہاں تک کہ حضرت عمرؓ جیسے جلیل القدر صحابی یہ کہہ بیٹھے کہ جو یہ کہے کہ محمدؐ کا انتقال ہو گیا اس کا سر قلم کر دوں گا، لیکن اتنے بڑے صدمہ سے دوچار ہونے کے باوجود اس وقت حضرت ابوبکرؓ نے جس جوانمردی کا ثبوت دیا، وہ بھی امن کے قیام کی ایک بیّن مثال ہے، سب سے پہلے آپ نے دلائل سے حضور ﷺ کی موت کو ثابت کیا، پھر منصب امامت کو سنبھالا اس کے بعد تجہیز و تکفین کے کام انجام پائے اور یہ حقیقت ہے کہ اس میں ذرا بھی تاخیر ہوتی تو بہت سے مفاسد وجود میں آتے، پھر اپنی خلافت کے زمانے میں ہر سو امن کو عام کیا، اور عندالوفات حضرت عمرؓ کو خلیفہ مقرر کر کے امن کی راہ کو ہموار کیا۔

۲-**حضرت عمر رضی اللہ عنہ** نے اپنے زمانۂ خلافت میں نظام امن کے قیام کے لئے بہت سی نئی چیزیں ایجاد کیں، راتوں کو گشت کرتے، ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی کی بات کو غور سے سنتے، اور صحیح ہو تو اس پر عمل کرتے، امن کی بقا کے لئے ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ وفات کے وقت آئندہ کون خلیفہ ہوگا اس کو طے نہیں کیا بلکہ چھ رکنی ٹیم تشکیل دی، جس میں ان کے فرزند بھی تھے، لیکن فرمایا کہ وہ مشورہ میں تو شریک ہوں گے لیکن خلیفہ ان کو نہ بنایا جائے گا، اگر چاہتے تو بنا دیتے اور وہ اس کے اہل بھی تھے، لیکن فساد کا خدشہ تھا، اس کا سد باب کر دیا۔

۳-**حضرت عثمان رضی اللہ عنہ** اپنے سابقہ دو خلیفوں کی راہ پر ہی گامزن تھے، یہاں تک کہ جب فتنہ انگیزیوں کا دور شروع ہوا اور بلوائیوں نے ان سے منصب خلافت سے الگ ہو جانے کا مطالبہ کیا، تو انھوں نے جان دے دی، لیکن ان کا مطالبہ پورا نہ کیا، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اگر خلافت ان فسادیوں کے ہاتھ جائے گی تو رہا سہا امن بھی غارت ہو جائے گا۔

۴-**حضرت علی رضی اللہ عنہ** آپ کا دور فتنوں سے بھرپور اور آزمائشوں کا دور تھا، غیر تو غیر اپنے بھی مخالف ہو گئے تھے اور یہ خلافت راشدہ کا آخری دور تھا جس کی حضور ﷺ نے اپنی حدیث میں پیشین گوئی فرمائی تھی، لیکن ان تمام فتنوں کے باوجود حضرت علی نے آخری دم تک خلافت کے کاروبار کو سنبھالے رکھا، اور امن وامان کے قیام کی ہر ممکن کوشش کی۔

انھی بزرگوں کی محنت اور کاوشوں کا نتیجہ ہے کہ آج تک وہ حکومتیں جہاں ان کا قائم کردہ نظام باقی ہے زیادہ امن وامان میں ہیں، بالمقابل ان حکومتوں کے جن میں ان اصول وقوانین کو نظر انداز کر کے نئے اصول اپنائے گئے، اللہ ان کے درجات بلند فرمائے، اور پھر وہ دور لائے جو امن وامان کا دور کہلائے۔ آمین۔

حضور ﷺ کا قیام امن کے لئے امکانات فساد کا قلع قمع کرنا

جس طرح اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے اقوال وتعلیمات اور اخلاق وکردار کے ذریعے امن کی تعلیم دی، اسی طرح اس نبی رحمت نے ظلم وشقاوت کی دنیا کو امن وسعادت کا گہوارہ بنانے کے لئے دنیا میں بدامنی وخونریزی کے جو اسباب ہو سکتے تھے

ایک ایک کر کے ان کو ختم کر دیا۔

۱- **شہنشاہیت**: دنیا میں فتنہ وفساد کا بڑا سرچشمہ شہنشاہیت رہا ہے، تاریخ شاہد ہے کہ قصر شاہی کی آبادی ورونق کے لئے رعیت کی جھونپڑیاں ہمیشہ اجڑتی رہی ہیں، پیغمبر اسلام نے سب سے پہلے فتنے کی اس جڑ کو صاف کیا، قرآن میں ہے: ﴿**ولا یتخذ بعضنا بعضاً أربابا من دون اللّٰہ**﴾ اور خدا کو چھوڑ کر ایک دوسرے کو اپنا پروردگار قرار نہ دے۔ یہاں تک کہ جب وفدِ بنی عامر نے آپ سے کہا: ''**أنت سیدنا**'' آپ ہمارے سردار ہیں، تو آپ نے جواب دیا: ''**السید اللّٰہ تبارک وتعالیٰ**'' سردار تو اللہ تبارک وتعالیٰ ہے۔

۲- **سرمایہ داری** یہ بھی امنِ عالم کے لئے بڑا فتنہ رہی ہے، اسلام نے ہر انسان کو وسائلِ معیشت سے فائدہ اٹھانے کا موقع دیا، لیکن کمانے اور خرچ کرنے کے طریقوں اور شکلوں پر ایسی پابندیاں عائد کر دیں جس سے دولت چند افراد کا سرمایہ بن کر نہ رہ جائے، قرآن میں ہے: ﴿**کی لا یکون دولۃ بین الأغنیاء منکم**﴾ اسلام نے ذخیرہ اندوزی، سود، قمار (جوا) وغیرہ کو ممنوع قرار دے کر وراثت، زکوٰۃ، عشر وغیرہ، تقسیم دولت کی صورتوں کو لازمی قرار دیا۔

۳- **وطنیت**: یہ بھی ہمیشہ سے ایک ایسا بت رہی ہے، جس پر ہزار ہا انسانوں کے سروں کے چڑھاوے چڑھتے رہے، اس سلسلے میں حضور ﷺ نے فرمایا: ''**لا فضل لعربی علی عجمی ولا لأحمر علی أسود**'' عربی النسل کو عجمی النسل پر اور سرخ رنگ والے کو کالے رنگ والے پر کوئی برتری حاصل نہیں۔

۴- **مذہبی منافرت**: اسلام نے پیغام محمدی کے قبول کرنے والے کے لئے تمام پچھلے پیغمبروں اور ان کے صحیفوں پر ایمان لانا ضروری قرار دیا، اس اقرار کے بغیر کوئی شخص مسلم تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

۵- **انتقام در انتقام**: یہ چکر بھی ہمیشہ دنیا میں خون کے طوفان برپا کرتا رہا، خود جزیرۃ العرب بعثت محمدی سے پہلے اس طوفان کی موجوں میں گھرا ہوا تھا، چراگاہوں میں، میلوں میں، یا شاعروں کی مجلس میں کسی بات پر جھڑپ ہو جاتی تو سیکڑوں تلواریں نیام سے باہر نکل آتی تھیں، اور پھر برسوں اور صدیوں تک ان کی برق افشانی جاری رہتی تھی، انتقام کے اس مجنونانہ جذبے میں مجرم وغیر مجرم اور حق وناحق کا کوئی فرق باقی نہ رہتا تھا، اسلام نے سب سے پہلے اس حقیقت کا اعلان کر دیا کہ خدا کی مخلوق کے درمیان پیدا ہونے والے جھگڑوں کا فیصلہ خدا ہی کے مقرر کردہ قانون کے مطابق اس حکومت کے ذریعے ہونا چاہئے، جو اس قانون کے نفاذ کے لئے قائم ہوئی ہے، قرآن میں ہے: ''**إن الحکم إلا للّٰہ**'' حکومت اور فیصلہ کا حق صرف خدا ہی کو حاصل ہے۔ (نقوش رسول نمبر، ج ۳، ص: ۴۶۴-۴۷۰، مضمون زین العابدین سجاد میرٹھی، بعنوان پیغمبر اسلام کا پیغام امن وسلام)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات امن اور دیگر مساعی امن : ایک موازنہ:

انسان چاہے کتنا ہی برا کیوں نہ ہو وہ امن وسکون کا طالب ہوتا ہے، یا پھر ہر زمانے میں کچھ نہ کچھ ایسے لوگ ہوتے ہیں جو امن وامان سکون اور شانتی اور سلامتی کے خوگر ہوتے ہیں، اسی بنا پر شروع زمانے سے اللہ تعالیٰ نے بھی ہر زمانے میں اس مقصد کی تکمیل کے لئے انبیاء کو بھیجا، چوں کہ حضور ﷺ سے پہلے جو انبیاء آئے، ان کا ایک محدود دائرہ مکان وزمان کے اعتبار سے ہوتا اور ان کی تعلیمات اس دائرے سے خارج نہیں ہوتیں، اس لئے مختلف زمانوں میں انسانوں میں سے خود بھی بعض مصلح بن کر ابھرے جیسے حضرت عیسیٰؑ کے دور نبوت کے بعد سکھ مذہب، جین مذہب، بدھ مذہب وغیرہ کا وجود ان میں سے ہر ایک کے بانی کا مقصد اپنے ذاتی تجربات کی روشنی میں امن وامان کو قائم کرنا ہی تھا، لیکن بعد کو ان کے متبعین نے ان تعلیمات کو اپنایا نہیں اور انھیں باتوں میں وہ گرفتار ہو گئے جس سے ان کو روکا گیا تھا، اسی طرح حضور ﷺ کے زمانے میں دو نبیوں کی امتیں موجود تھیں ایک حضرت موسیٰ کے ماننے والے یہود تو دوسرے حضرت عیسیٰ کو ماننے والے نصاریٰ۔ لیکن یہ بھی اپنی تعلیمات کو کھو چکے تھے، بجائے امن وامان کے فساد وتخریب کے داعی بن گئے تھے، اس

میں کوئی شک نہیں کہ ان میں سے کچھ مذاہب کا وجود بروقت اور برمحل بھی ہوا لیکن اس کو دوام حاصل نہ ہوسکا، اسی طرح حضورﷺ کی آمد کے بعد بھی حضورﷺ کی تعلیمات کو صحیح نہ سمجھنے کی بنا پر مختلف زمانے میں امن وسکون کے حصول کے لئے مختلف کوششیں کی گئیں، کبھی جمہوریت کو ہر مرض کی دوا سمجھا گیا، تو کبھی اشتراکیت کا نعرہ لگایا گیا، لیکن ان میں سے کسی کو دوام نہ حاصل ہوسکا، یہودیوں نے اپنے مذہب میں اتنی سختیاں کرلیں کہ جو انسان برداشت نہ کرسکے، عیسائیت میں امن وامان اور عفو ودر گذر پر اتنا زور دیا گیا کہ انصاف وعدل کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا، جین مت وبدھ مت ودیگر مذاہب میں ایک تو مکمل تعلیمات تھی ہی نہیں، اگر تھیں بھی تو انسانی فطرت کے مطابق نہ تھیں، کیوں کہ وہ ایک انسان کے تجربات کا نتیجہ تھا، جس میں ہر لمحہ غلطی کا امکان ہے، جہاں تک جمہوریت کا تعلق ہے تو بقول علامہ اقبال: ''شہنشاہیت کے چہرے پر جمہوریت کی نقاب ڈال دی گئی، ایک مہذب اور ہر طرح سے مکمل دستوری ڈھانچہ ایسا تیار ہوا جس میں مہذب انسان کو فریب اور دھوکہ بازی کے سوا کچھ نہ ملا، ایک دو یا اس سے زیادہ سربرآوردہ طبقات نے تمام طبقات کے حقوق چھین کر اپنی تجوریاں بھرلیں، پہلے نوابوں اور راجاؤں کا دور دورہ تھا، جمہوری نظام میں وزرائے عالی مقام نے وہ پوزیشن سنبھال لی''۔

اشتراکیت کا بھرم بھی کھل گیا، ایک خونی ڈرامہ جو ستر سال تک جمہور کے نام پر جمہور کو جانوروں کی سطح پر رکھنے کا چل رہا تھا، وہ ختم ہوا، اور یہ بھی معلوم ہو کہ سویت یونین کی اشتراکیت اور نازی اشتراکیت کے درمیان سخت جنگ تھی۔

اس سائنس وٹکنالوجی کے زمانے میں ایجادات کو امن کا ذریعہ سمجھا گیا، اور امن کی بحالی کے لئے اس کا استعمال کیا گیا، لیکن ہم اپنے گردوپیش کے حالات سے بے خبر نہیں ہیں، ہمیں بھی وہ ایجادات نظر آتی ہیں، مگر اس کے ساتھ یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ ان ایجادات نے انسان کو اتنا فائدہ نہیں پہنچایا ہے جس قدر ان سے نقصانات ہوئے ہیں، فیکس انٹرنیٹ وٹی وی سے صرف خبریں اور کتابیں ہی نہیں بلکہ ساتھ ساتھ رذائل کا ایک سیلاب بھی گھر گھر داخل ہوگیا ہے، ہر ملازم پیشہ مقروض ہے، سود کی وبا اس قدر عام ہے کہ کوئی شخص چائے کی ایک پیالی بھی پیتا ہے تو اس میں سود کا تخم موجود ہے۔

اسلام نے زندگی کا پیغام زندگی کے ہر میدان میں دیا ہے، اس کا نظام عقوبت بھی عدل پر قائم ہے، قتل کا بدلہ قتل عادلانہ نظام ہے، کیوں کہ اسی سے قاتلوں کی ہمت شکنی ہوتی ہے، اور دوسروں کو عبرت ہوتی ہے، اس کے برخلاف رومن قانون پر چلنے والی عدالتوں میں ہر جرم کی پرورش ہوتی ہے، کیوں کہ قاتل کو معلوم ہے کہ ضروری نہیں کہ اس کو سزا ملے، سفارش، رشوت اور وکلاء کی مہارت سے ہزاروں قاتل بچ گئے اور سینکڑوں بے گناہ مارے گئے، چور کی سزا اسلام نے جو مقرر کی ہے اس پر ساری دنیا میں واویلا ہے، اسلامی قانون کو جنگل کا قانون، بے رحمی اور شقاوت کا عنوان دیا جاتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اسلامی قانون سے ہی دنیا میں امن قائم ہوسکتا ہے۔

طلاق کے مسئلہ کو لیجیے یورپ اور افریقہ میں تو ایک عورت کی حیثیت اس گندے اور میلے تولیہ کی ہے جو کسی تھرڈ کلاس کی ریسٹورنٹ میں واش بیسن کے ساتھ لٹکا دیا جاتا ہے ہے، ہر کھانے والا اپنے ہاتھ پونچھتا ہے، اسی طرح سفید چمڑی والے یوروپین اور سیاہ چمڑے والے افریقین جب چاہتے ہیں ذرا سی بات پر طلاق دے کر کورٹ میں رجسٹری کرالیتے ہیں۔

اسلام جو حقیقت پسند دین ہے اور انسان کے خالق کا بتایا ہوا دین ہے وہ اپنی مخلوق کی نفسیاتی کشائش سے واقف ہے اور انسانی زندگی کی اونچ نیچ کو جانتا ہے اس نے طلاق وخلع کو ایک خاص قانون کے اندر کنٹرول میں رکھا ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ حضورﷺ کی امن کی تعلیمات کو عام کیا جائے اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کی جائے، کہ اس میں دنیا وآخرت کی فلاح وکامیابی مضمر ہے۔

وماتوفیقی إلا باللّٰہ، علیہ توکلت والیہ أنیب

☆☆☆

تاریخ کے جھروکوں سے

مسجدِ نبوی کے ستون-تاریخی پسِ منظر

محمد سراج الہدی ندوی ازہری
استاذ دارالعلوم سبیل السلام، حیدرآباد
sirajazhari@gmail.com

تاریخ وسیر کی کتابوں سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ عہدِ رسالت میں مسجدِ نبوی کی تعمیر میں ستون کے طور پر کھجور کے تنے استعمال کیے گئے تھے۔ بعد کے زمانے کی ہر توسیع وتعمیر میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا کہ مسجدِ نبوی کے عہدِ رسالت والے کھجور کے ستونوں کو پختہ ستونوں میں باقی رکھا جائے، اسے ختم نہیں کیا جائے، مسجد کی جو بھی توسیع ہوئی ہو، وہ اس کے دائیں بائیں، آگے پیچھے ہو؛ لیکن ان اہم جگہوں کو باقی رکھا جائے، اس اہتمام کی بنیاد پر ہم پورے وثوق کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ عہدِ نبوی کے ستون ابھی بھی انہی جگہوں پر ہیں، جس جگہ آپ ﷺ کی حیات طیبہ میں کھجور کے ستون تھے۔

ان ستون کو باقی رکھنے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ان سے بہت ساری یادیں وابستہ ہیں، انہیں دیکھ کر ایمان کو تازگی نصیب ہوتی ہے، عشقِ نبی کی دبی چنگاری بھڑک اٹھتی ہے اور عہدِ نبوی کی ایک خاص تصویر ذہن ودماغ کے نہاں خانوں میں گردش کرنے لگتی ہے۔ یہ دیکھو! یہی وہ ستون ہے جہاں ہمارے آقا وفود سے ملاقات کرتے تھے۔ ادھر دیکھو! یہاں رمضان کے ایام میں اعتکاف کے لیے آقا کی چارپائی رہا کرتی تھی۔ یہ دیکھو! اس ستون کے پاس مہاجرین بیٹھا کرتے تھے۔ ادھر وہ ستون ہے جہاں قرآن رکھا جاتا تھا۔ یہ دیکھو! یہی وہ ستون ہے جہاں ایک صحابی رسول ﷺ نے اپنے ایک گناہ کی معافی کے لیے اپنے آپ کو باندھ دیا تھا۔ ذرا ادھر بھی تو دیکھو! یہ وہ ستون ہے جس کے پاس نماز پڑھنے کو ایک خاص فضیلت حاصل ہے۔

آج کی طویل وعریض مسجدِ نبوی میں عہدِ نبوی کی اس مسجد کو سمجھنے کے لیے اس بات کو ذہن میں رکھیے کہ اس مسجد کی سمت قبلہ میں ترکی عہد کا تعمیر شدہ حصہ واقع ہے، اس حصہ میں کچھ سرخ ستون ہیں، جن پر سنہری لمبی لکیریں ڈالی گئی ہیں، یہ عہدِ نبوی کی مسجد کی نشان دہی کرتا ہے، یعنی جتنے حصے میں ایسے ستون واقع ہیں، وہ سب حضور ﷺ کے عہد کی اصل مسجد ہے، منبر اطہر اور قبر شریف کے درمیان کچھ حصہ ہے، جس میں سرخ سنگی ستون پر سفید سنگ مرمر کی پٹیاں جڑی ہوئی ہیں اور سرخ کے بجائے سفید قالین بچھی ہوئی ہیں، جس پر سبز کشیدہ کاری ہے، یہ حصہ ''ریاض الجنہ'' کا ہے، اس کو آپ ﷺ نے جنت کی کیاری قرار دیا ہے۔ (بخاری، کتاب فضل الصلاۃ: ۱۱۹۵، مسلم، کتاب الحج: ۱۳۹۰)

یوں تو مسجدِ نبوی کی فضیلت کے ساتھ ساتھ عہدِ نبوی کی مسجدِ نبوی کا ہر ستون بابرکت ہے اور اسے کچھ نہ کچھ تاریخی حیثیت حاصل ہے، تاہم ان میں کے آٹھ (۸) ستون خاص مقام ومرتبہ اور امتیازی شان کے حامل ہیں۔ اسی اعزاز کے پیش نظر ان ستونوں پر ان کے نام بھی لکھے ہوئے ہیں۔ مسجدِ نبوی کے ''ریاض الجنۃ'' والے حصے میں کھڑے ہوکر نظر

دوڑائیں تو آپ کو یہ ستون نظر آئیں گے؛ البتہ دو ستون اب حجرۂ مطہرہ کے اندر ہیں؛ اس لیے ان کی زیارت مشکل ہے۔ آیئے ذیل کے سطور میں ان آٹھوں ستون کے نام اور تاریخی پس منظر معلوم کرتے ہیں۔

(۱) ستون مُخَلقه: اس کو "**ستون حنانه**" اور "**عَلم مصلی النبی ﷺ**" (رسول اللہ ﷺ کی جائے نماز کا نشان) بھی کہتے ہیں۔ یہ ستون محراب النبی صلی اللہ علیہ کی پشت کے ساتھ ملا ہوا ہے۔

اس ستون پر "**الاسطوانة المخلقة**" لکھا ہوا ہے۔ "مخلق" اس چیز کو کہتے ہیں جس پر عطر بیزی کی گئی ہو۔ "خلوق" خوشبو کو کہتے ہیں۔ روایتوں میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عثمان بن مظعونؓ نے مسجد میں تھوک دیا، اس کے بعد وہ بے چین ہوگئے۔ اہلیہ نے پریشانی کا سبب دریافت کیا۔ تو کہا: مجھے کچھ نہیں ہوا، البتہ میں نے نماز کی حالت میں ستون پر تھوک دیا، اسی وجہ سے پریشانی سی ہو رہی ہے۔ ان کی اہلیہ محترمہ وہاں گئیں اور ستون کو دھو کر اس پر خوشبو مل دی، تاریخ میں سب سے پہلے قبلہ کو معطر کرنے والی یہی خاتون ہیں۔ "ستون مخلق" اس وقت قبلہ تھا۔ (مسجد نبوی کی تعمیر وتوسیع تاریخ کے آئینہ میں، مترجم: محمد مصطفیٰ خان ندوی، ص:۸۲)

اس کو "**ستون حنانه**" کہنے کی وجہ یہ ہے کہ عہدِ نبوی میں اس جگہ کھجور کا ایک خشک تنا گڑا ہوا تھا، جس کا سہارا لے کر آپ ﷺ وعظ فرمایا کرتے تھا۔ جب آپ ﷺ کے لیے منبر تیار ہوا اور آپ ﷺ نے اس پر بیٹھ کر خطبہ دینا شروع فرمایا، تو یہ تنا فرقت کی تاب نہ لاکر آہ وبکا کرنے لگا، اسی وقت حضور ﷺ منبر سے نیچے تشریف لائے، اس پر دستِ شفقت رکھا، تب جاکر اس کا رونا بند ہوا، یہ تنا اسی جگہ مدفون ہے۔

(۲) ستون قرعه: اسے "**ستون عائشه**" اور "**ستون مهاجرین**" بھی کہا جاتا ہے۔ یہ منبر مبارک، قبر شریف اور قبلہ کی دیوار تینوں سے تیسرے نمبر پر واقع ہے۔

"**ستون قرعه**" سے موسوم ہونے کی وجہ یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: "یقیناً اس مسجد میں اس ستون کے سامنے ایسی جگہ ہے کہ اگر لوگوں کو معلوم ہوجائے تو اس کے لیے قرعہ اندازی کریں۔ لوگوں نے دیکھا تو وہاں صحابہ کی ایک جماعت اور مہاجرین کے لڑکے بیٹھے تھے، سو وہ "ستون قرعہ" ہے۔ (جامع الاحادیث للمسانید، علامہ سیوطی: ۸/ ۴۳۸)

"**ستون عائشه**" اس لیے نام پڑا کہ حضرت عائشہؓ ہی نے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کو اس ستون کی فضیلت بتائی، تو وہ وہاں نماز پڑھنے لگے، تو لوگ سمجھ گئے کہ اس ستون کی نشان دہی حضرت عائشہؓ نے کی ہے۔ تبھی سے اس کا نام "**ستون عائشه**" پڑ گیا۔ (**وفاء الوفاء باخبار دار المصطفی**، علی بن احمد سمہودی: ۲/ ۴۴۰)

"**ستون مهاجرین**" اس لیے کہا جاتا ہے کہ قریشی مہاجرین وہاں جمع ہوا کرتے تھے اور اس مجلس کو مجلس مہاجرین کہا جاتا تھا۔ (**وفاء الوفاء باخبار دار المصطفی**، علی بن احمد سمہودی: ۲/ ۴۴۱)

(۳) ستون توبه: اس کا ایک دوسرا مشہور ومعروف نام "**ستون ابو لبابه**" بھی ہے۔ منبر سے چوتھے نمبر پر، قبر شریف سے دوسرے نمبر پر، اور قبلہ کی دیوار سے تیسرے نمبر پر واقع ہے۔

صحابیِ رسول حضرت ابولبابہؓ یہود کے ایک قبیلے بنو قریظہ کے حلیف تھے۔ ایک واقعہ میں بنو قریظہ نے ان سے مشورہ لیا کہ کیا وہ رسول اللہ ﷺ کے فیصلے پر راضی ہوجائیں؟ انہوں نے ہاں کہا اور اپنے ہاتھ سے گردن پر اشارہ کر دیا، یعنی قتل کیے جانے کی خبر دی، خود ابولبابہؓ کا بیان ہے کہ مجھے فوراً احساس ہوگیا کہ میں نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ خیانت کی ہے، وہ سیدھے مسجد نبوی گئے اور اپنے آپ کو کھجور کے ایک ستون سے باندھ لیا اور قسم کھالی کہ نہ تو وہ خود کو کھولیں گے اور نہ

تو کوئی دوسرا ان کی بندش کو کھولے گا، تا آں کہ رسول اللہ ﷺ آزاد کریں یا آسمان سے ان کی توبہ اترے، رات کے وقت وحی نازل ہوئی اور ان کی توبہ قبول فرمالی گئی، جب آپ ﷺ فجر کی نماز کے لیے نکلے اور ان کے پاس سے گزر ہوا تو ان کو آزاد کردیا، اسی وجہ سے یہ ''ستون توبہ'' کے نام سے موسوم ہوا اور صحابیٔ رسول کے نام کی مناسبت سے ''ستون ابو لبابہ'' کہلایا۔ قرآن کی یہ آیت انہی کے سلسلے میں نازل ہوئی ''یٰایھا الذین امنوا لا تخونوا اللہ والرسول وتخونوآ امٰنٰتکم وانتم تعلمون''۔ (سورہ انفال ۲۷)

(۴) ستون سریر: یہ ''ستون توبہ'' کے مشرق میں روضہ شریفہ میں کھلنے والی کھڑکی سے متصل ہے۔ رمضان المبارک کے دنوں میں یہ آپ ﷺ کی جائے اعتکاف تھی، کھجور کی شاخوں سے تیار کی ہوئی چارپائی اس ستون کے پاس رکھ دی جاتی تھی، اور اس پر آپ ﷺ کا تکیہ رکھ دیا جاتا تھا۔ یہیں پر آپ ﷺ آرام فرماتے تھے۔ اسی مناسبت سے یہ ''ستون سریر'' کہلایا۔ (المسجد النبوی الشریف عبر التاریخ، محمد سید وکیل، ص:۵۳)

(۵) ستون حراسہ: اس کو ''ستون علی بن ابی طالب'' بھی کہتے ہیں، یہ ''ستون سریر'' کے عقب میں شمال کی جانب واقع ہے اور اس دروازے کے سامنے ہے جس سے آنحضور ﷺ نکل کر نماز کے لیے جاتے تھے۔

''ستون علیؓ'' کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ وہاں بیٹھ کر آپ ﷺ کی پہرہ داری کیا کرتے تھے۔ (وفاء الوفاء باخبار دار المصطفی، علی بن احمد سمہودی: (۲/۴۴۸) اور ''حراسہ'' کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے معنی پہرہ داری کے ہیں، اور جیسا کہ ابھی یہ بات گزری کہ حضرت علیؓ وہاں بیٹھ کر پہرہ داری کیا کرتے تھے۔

(۶) ستون وفود: یہ شمال کی جانب سے ''ستون حراسہ'' کے عقب میں ہے، رسول اللہ ﷺ اس کے پاس بیٹھ کر عرب کے وفود سے ملاقاتیں کرتے تھے، یہ ''مجلس قلادہ'' کے نام سے بھی جانا جاتا ہے، یہاں عالی مرتبت صحابہؓ کی مجلس ہوا کرتی تھی۔

(۷) ستون جبرئیل: یہ ستون مبارک حضرت فاطمہؓ کے حجرۂ پاک سے متصل اور ''اصحاب صفہ'' کے چبوترہ کے ٹھیک سامنے قبلہ کی سمت اس دیوار کے اندر ہے، جو حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے حجرۂ شریفہ کے چاروں طرف بنوائی تھی، یہ دیوار کے شمال مغربی زاویے میں ''ستون وفود'' والی قطار میں ہے، مسجد نبوی کی زیارت کرنے والے وہاں نہیں پہنچ سکتے اور نہ ہی دیکھ سکتے۔ (المسجد النبوی عبر التاریخ، محمد سید وکیل، ص:۵۵)

یہی وہ مقام ہے جہاں حضرت جبرئیلؑ سے آپ ﷺ کی ملاقات ہوتی تھی۔ وصال سے قبل رمضان المبارک میں حضور ﷺ نے حضرت جبرئیلؑ کے ساتھ قرآن کا دور بھی اسی جگہ فرمایا تھا۔

اسی ''ستون جبرئیل'' کو بعض لوگوں نے ''ستون مربع القبر'' بھی لکھا ہے اور اسی نام سے دیگر تفصیلات بیان کی ہیں۔ (مسجد نبوی کی تعمیر وتوسیع تاریخ کے آئینہ میں، مترجم: محمد مصطفیٰ خان ندوی، ص:۸۶)

(۸) ستون تہجد: یہ ستون شمال کی جانب سے حضرت فاطمہؓ کے گھر کے پیچھے واقع ہے، اس کے پاس چھوٹی سے محراب ہے، اگر محراب کی جانب رخ کر کے کھڑے ہوں تو یہ ستون بائیں جانب باب جبرئیل کی طرف ہوگا، اس پر سنگ مرمر کی تختی پر لکھا ہے ''ھذا متھجد النبی صلی اللہ علیہ وسلم''۔ (مسجد نبوی کی تعمیر وتوسیع تاریخ کے آئینہ میں، مترجم: محمد مصطفیٰ خان ندوی، ص:۸۷) لیکن باہر قرآن پاک کی الماریوں کے سبب زیارت مشکل ہے۔

اخیر میں اللہ سے دعا ہے کہ ان آثار مقدسہ کی عظمت و وقار ہمارے درمیان باقی رکھے اور ہم جیسے گنہ گاروں کو بار بار زیارت کی توفیق دے، آمین۔

☆☆☆

تاریخ کے جھروکوں سے

ٹیپو سلطان اور رواداری

محمد فرید حبیب ندوی
استاذ: مدرسۃ العلوم الاسلامیہ، علی گڑھ

آر ایس ایس کی طرف سے ایک بیان میں ٹیپو سلطان کو عدم رواداراور متعصب بادشاہ کہا گیا، اس طرح ایک اور سچے سپاہی کے چہرے پر دھبہ لگانے اور ایک عظیم شخصیت کو داغدار کرنے کی ناپاک کوشش کی گئی۔

ٹیپو سلطان کا شمار بلا شبہ ان جانباز ہیروز میں ہے جن پر ہندوستان کو ناز ہے، جو ہندوستان کے لئے وجہ فخر اور لائق صد افتخار ہیں، جو ہندوستان کی پیشانی کا نور ہیں، ٹیپو ہندوستان کی تاریخ کا ایک روشن ستارہ ہے، اس کی قربانیوں کو فراموش کرنا احسان فراموشی اور ناشکری کی سب سے بڑی مثال ہے۔

انگریزوں نے اول روز سے ہی ''لڑاؤ اور حکومت کرو''(Devide and Rool) کی پالیسی پر عمل کیا ہے، مگر جاتے جاتے بھی وہ ایسے جراثیم چھوڑ گئے جو ہر وقت ہندوستان کی گنگا جمنی فضا کو مسموم کرتے رہتے ہیں، انگریزوں نے ہندوستان یا ہندوستانیوں کی جو تاریخیں لکھیں ان میں یہ چیز قدر مشترک ہے کہ مسلمانوں کو اور مسلمان ہیروز کو ایک متعصب اور کٹر مذہبی شخصیت کے طور پر پیش کیا گیا ہے، اور تاریخ کو مسخ کرکے یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ مسلم حکمرانوں نے ہندوستان کی غیر مسلم آبادی پر نہ صرف یہ کہ ظلم وزیادتی کی ہے بلکہ جبراً ان کا مذہب تبدیل کرانے کی بھی کوشش کی۔

مگر ان انگریز مؤرخوں سے زیادہ افسوس ہمیں خود اپنے اوپر ہوتا ہے کہ انگریزوں کی مذکورہ پالیسی کو جانتے ہوئے بھی ہم نے ان کی ان باتوں پر یقین کیسے کرلیا جن سے ایک طرف ہمارے ہندوستان کی غلط تاریخ سامنے آتی ہے اور دوسری طرف یہ ہندوستان کی مستقبل کی زندگی کا ایسا ناسور ہے جس کے ہوتے ہوئے نہ جیتے بنتی ہے نہ مرتے، اور ایک ایسی بیماری ہے جو پورے ملک کو اندر سے کھائے جارہی ہے، اور جس نے ملک کو موت وزیست کے درمیان ایک عجیب کشمکش میں مبتلا کرکے رکھدیا ہے، اور جس کی نحوست سے ملک کا مستقبل موہوم ہوتا جارہا ہے۔

انگریز اور اب ان کے مشن کو آگے بڑھانے والی آر ایس ایس کی ایک چال یہ ہے کہ ہندوستان میں اور ہندوستان کی آزادی میں جن مسلمان فرمانرواؤں کی ناقابل فراموش قربانیاں رہی ہیں ایک ایک کرکے ان پر ایسے الزامات لگادئے جائیں کہ پھر آزادی کی تاریخ میں ان کا نام بھی نہ لیا جائے، اس مقصد سے آزادی کی تاریخ بدل گئی، اور اب لے دے کے جو چند مسلم حکمراں ایسے رہ گئے ہیں جن کا نام آج بھی آزادی کی یاد تازہ کردیتا ہے، جن کا ذکر سنتے ہی گردنیں خم ہوجاتی اور سر جھک جاتے ہیں، اور جن کے نام کو آج بھی بڑے اعزاز کے ساتھ لیا جاتا ہے انہیں بھی بدنام کرکے ایک ایسی تاریخ بنانے کی کوشش کی جارہی ہے جس میں کسی مسلمان لیڈر کی

قربانیوں کا ذکر نہ ہو، ٹیپو سلطان پر آر ایس ایس کا حالیہ بیان اسی در پردہ سازش کا ایک حصہ ہے۔

ٹیپو سلطان ہندوستان کے سر کا تاج تھا، ہندوستان کا کوہ نور تھا اور ملک کا ایک عظیم سپوت تھا اور بقول مولانا علی میاں ''ہندوستان کی تاریخ ٹیپو سلطان سے زیادہ بلند ہمت، بالغ نظر، مذہب و وطن کے فدائی اور غیر ملکی اقتدار کے دشمن سے آشنا نہیں۔''

جب تک ٹیپو سلطان زندہ رہا انگریز اپنے منصوبوں میں رنگ بھرنے میں ناکام رہے، ان کے لئے ٹیپو سلطان ایک آہنی دیوار تھا جسے پار کرنا ان کے لئے ممکن نہ تھا، ٹیپو سلطان کی شہادت پر انگریزوں کے جو تاثرات تھے ان سے اس بات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے:

''جنرل ہیرس کو جب سلطان کی شہادت کی خبر پہنچی تو لاش کے پاس آکر فرط مسرت سے پکار اٹھا'' آج ہندوستان ہمارا ہے''

ایک انگریز مؤرخ لکھتا ہے: ''ہندوستان میں انگریزوں کی راہ میں ٹیپو ہی ایک سنگ گراں تھا''۔ (تحریک آزادی میں علماء کا کردار، فیصل احمد ندوی بھٹکلی ص ۲۲۰-۲۱۹) یہ سنگ گراں جب تک حائل تھا ان کی ناک میں دم کر رکھا تھا، اور جب انہوں نے اسے ہٹا دیا تب کہیں جا کر چین کا سانس لیا۔

بہر حال یہاں ٹیپو کی عظمت دکھانا مقصود نہیں، بلکہ ٹیپو کی رواداری کا ذکر اصل مقصود ہے، یہ باتیں تو ضمناً ذکر کر دی گئیں، تا کہ اس بات کا اندازہ ہو سکے کہ جس شخصیت کو بدنام کرنے کی کوشش کی جارہی ہے وہ کتنی عظیم اور بے نظیر شخصیت تھی۔

الغرض، ٹیپو سلطان ایک رحم دل، انصاف پسند، اور روادار حکمراں تھا، اس نے ہر مذہب والوں کو مذہبی آزادی عطا کی تھی، اور نہ صرف مذہبی آزادی عطا کی تھی بلکہ بڑے بڑے عہدے اور مناصب پر بھی انہیں فائز کیا تھا۔ بعض انگریز مؤرخوں نے ٹیپو کو بھی متعصب حکمراں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، مگر یہ تاریخ کے ساتھ کھلا ہوا مذاق اور اس کے چہرہ کو مسخ کرنے کی کوشش ہے۔ انصاف پسند مؤرخین نے ہمیشہ ٹیپو کو ایک باغیرت، مہم جو اور منصف و روادار حکمراں تسلیم کیا ہے۔

ٹیپو سلطان نے جب کبھی کسی کو کوئی سزا دی تو اس کے پیچھے مذہبیت کبھی کارفرما نہ رہی، بلکہ سیاسی اعتبار سے ایک حاکم جو کرتا ہے وہی سلطان نے کیا، چنانچہ جہاں اس نے ہندوؤں اور عیسائیوں کو سزائیں دیں وہی اس نے مسلمانوں کو بھی سزائیں دیں، اور سزاؤں کی وجہ زیادہ تر یہ رہی کہ ان لوگوں نے یا تو نمک حرامی اور غداری کی تھی، یا ٹیپو کو ان پر در پردہ سازش کرنے کا شبہ ہوا تھا۔

اگر ٹیپو متعصب اور عدم روادار حکمراں ہوتا تو کبھی بھی ہندوؤں کو اعلی عہدے نہ عطا کرتا، مندرجہ ذیل اقتباسات سے ٹیپو کی رواداری کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

''ٹیپو متعصب نہیں بلکہ ایک روشن خیال حکمراں تھا، جس نے اپنی حکومت میں ہندوؤں کو اعلی منصب عطا کیے، انہیں پرستش کی مکمل آزادی دی۔''

''حیدر علی نے ہندوؤں کو ذمہ دار عہدوں پر مامور کیا تھا، ٹیپو نے بھی اپنے باپ کی اس پالیسی کو جاری رکھا۔ پرنیا میر آصف کے بیحد اہم منصب پر اور کرشنا راؤ کو افسر خزانہ کے عہدے پر اس نے فائز کیا تھا، شمیا آینگر ڈاک اور پولیس کا وزیر تھا۔ اس کے بھائی نرسنگا راؤ کے پاس سرنگاپٹم میں متعدد اہم عہدے رہے تھے۔ سری نواس راؤ اور اپاجی رام ٹیپو کے معتمد خصوصی تھے، جنہیں اہم سفارتی مشنوں پر بھیجا جاتا تھا۔ مولچند اور سوجان رائے مغل دربار میں اس کے وکیل تھے۔ نائک راؤ اور نائک سنگانا پر بھی سلطان کو حد درجہ اعتماد تھا۔ اس کا پیش کارِ خاص سبا راؤ ہندو تھا۔ اس کا ایک منشی نرسیا بھی ہندو ہی تھا۔ ایک برہمن کو کورگ کا فوجدار مقرر کیا گیا۔ ایک اور برہمن کو مالابار کے جنگل کاٹنے کا بلا شرکت غیرے ٹھیکہ دیا گیا تھا۔ ایک دوسرے برہمن کو کوئمبٹور کا آصف مقرر کیا گیا، پھر یہی عہدہ اسے پالگھاٹ میں دیا گیا۔ ٹیپو کے بہت سے

عامل اور مال کے افسر ہندو تھے۔فوج میں بھی ہندوؤں کو اہم عہدے دیے گئے تھے۔ ہری سنگھ بے قاعدہ سواروں کا رسالدار تھا۔ نائروں کی بغاوت کو کچلنے کے لئے روشن خاں کے ساتھ سری پت راؤ کو بھی متعین کیا گیا تھا۔ سیواجی، جو مرہٹہ تھا، اس کے ہاتھ میں تین ہزار سواروں کی کمان تھی اور ۱۷۹۱ میں بنگلور کے محاصرہ کے وقت وہ بڑی دلیری سے لڑا تھا۔ راما راؤ نامی ایک برہمن بھی سواروں کا کمانڈر تھا۔'' (تاریخ ٹیپو، محبّ الحسن، ص ۴۹۰-۴۹۱)

کچھ مرہٹوں نے ایک مندر پر حملہ کر دیا تھا، مندر کے سوامی نے اس کی خبر سلطان کو لکھی تو سلطان کو اس پر سخت رنج ہوا اور اس نے مجرموں کو سزا دینے کا حکم جاری کیا۔

''ٹیپو نے ہندوؤں کو پوجا پاٹ کی مکمل آزادی تھی۔ سری رنگا ناتھ کا مندر قلعہ سرنگا پٹم کے حدود میں، محل سے صرف سو گز مغرب میں واقع تھا جہاں سے سلطان روزانہ مندر کے گھنٹوں کی آوازیں اور برہمن پجاریوں کے بھجن سنا کرتا تھا، لیکن اس نے کبھی بھی اس میں مداخلت نہیں کی۔ (تاریخ ٹیپو سلطان، محبّ الحسن، ص ۴۹۴)

ٹیپو پر یہ الزام بھی عائد کیا جاتا ہے کہ اس نے اپنی مملکت کے تمام مندروں اور برہمنوں کی ساری جائدادیں ضبط کر لی تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نے ان اراضیوں کو ضبط کیا تھا جن پر ناجائز قبضہ تھا، اور ان تمام جائدادوں کو چھوڑ دیا تھا جن کے لئے سابقہ حکمرانوں کی سندیں پیش کی گئی تھیں۔ ایک مراٹھی سند کے مطابق، جو اس نے اپنے عامل دار کو پنپا کے نام جاری کی تھی، پشیا گیری کے سوامی کو تھونگا پلی او رگولا پلی کے مواضعات کی مالگذاری وصول کرنے کا حق دیا گیا تھا۔ (تاریخ ٹیپو سلطان، محبّ الحسن ص ۴۹۳)

اسی طرح اس نے عیسائیوں کے ساتھ بھی بہت اچھا طرز عمل اختیار کیا، اور جن عیسائیوں کو سزا دی تو وہ ان کی بغاوت کی وجہ سے دی۔

''ان تمام باتوں سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اپنی مملکت کے عیسائیوں کے ساتھ ٹیپو کے طرز عمل کا محرک مذہبی جذبہ نہیں تھا بلکہ سیاسی مصالح تھے۔ کنارا کے عیسائیوں کو اس لئے سزا نہیں دی گئی تھی کہ وہ عیسائی تھے، بلکہ اس کا سبب یہ تھا کہ انہوں نے غداری کی تھی'' (تاریخ ٹیپو سلطان، محبّ الحسن ص ۴۹۹)

بہر حال، صحیح تاریخ یہ بتاتی ہے کہ ٹیپو سلطان ایک انصاف پسند، عادل، روادار اور رحمدل بادشاہ تھا، وہ اگر ایک طرف اپنے مذہب پر سختی سے عمل کرتا تھا تو دوسری طرف دوسرے مذہب والوں کو مذہبی آزادی بھی دیتا تھا۔ اور جب کبھی اس نے ہندوؤں یا عیسائیوں کو سزا دی تو ان کے ہندو یا عیسائی ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کے جرم کی وجہ سے، یہی وجہ ہے کہ اس نے سزا دینے میں کبھی ہندو مسلم کی تفریق نہیں کی، ان کی سزاؤں کی وجوہات سیاسی تھیں نہ کہ مذہبی۔

اور آخر سلطان تعصب وعدم رواداری سے کیسے کام لیتا جبکہ اسے اس کا مذہب خود اس کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ اسلام کی تعلیم کی بنیاد ہی اس پر ہے کہ ہر ایک کو مذہبی حقوق حاصل ہوں، ہر ایک کو اپنے مذہب کے مطابق عمل کرنے کی آزادی دی جائے۔ کسی پر مذہبی جبر وتشدد نہ کیا جائے، اور یہی وجہ ہے کہ ہندوستان پر مسلم حکمرانی کے اس طویل دور میں کبھی کسی مسلم حکمراں نے یہاں کی آبادی پر اسلام قبول کرنے کا زور نہیں ڈالا، اگر ایسا کیا ہوتا تو آج مسلمان اقلیت میں نہ ہوتے۔ ٹیپو بھی ایک سچا مسلمان تھا، وہ اسلام کی تعلیم پر عمل کرتا تھا، وہ کیسے کسی پر مذہبی جبر کر سکتا تھا، اور کیسے کسی کا مذہبی حق چھین سکتا تھا، جو کہ ہر ایک کو فطرت کی طرف سے ودیعت کیا گیا ہے، لہذا اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ ٹیپو ایک سچا محبّ وطن، انصاف جو اور رواداری کا علمبردار بادشاہ تھا، جس نے اس ملک کی ترقی کو ہمیشہ مطمح نظر بنائے رکھا اور آخر اس کے لئے اپنی جان بھی گنوادی۔

☆☆☆

اسلامی تعلیمات

اسلام اور نحوست و بدفالی

محمد قمر الزماں ندوی
جنرل سکریٹری: مولانا علاء الدین ایجوکیشنل سوسائٹی، جھارکھنڈ
maeducationalsociety@gmail.com

تمہید

مذہب اسلام خدائے وحدہ لاشریک کا منتخب اور پسندیدہ مذہب ہے۔ اور سب سے اچھا اور سچا مذہب ہے۔ ارشاد خداوندی ہے۔ إن الدين عند الله الاسلام۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک قابل قبول دین صرف اور صرف اسلام ہے۔ اگر کوئی شخص اس کے علاوہ کوئی اور مذہب اختیار کرے گا تو وہ اللہ کے یہاں قابل قبول نہ ہوگا، اور وہ شخص دونوں جہاں میں رسوا اور ناکام و نامراد ہوگا، خود اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ومن يتبع غير الاسلام دينا فلن يقبل منه وهو فى الآخرة من الخاسرين۔ (ترجمہ) اور جو کوئی اسلام چھوڑ کر اور دین چاہے تو اس سے ہرگز قبول نہ ہوگا، اور ایسا آدمی آخرت میں گھاٹے میں رہے گا۔

اسلام کی امتیازی خصوصیت:

مذہب اسلام بنی نوع انسان کو فضول اور لغو کاموں سے روکتا ہے۔ جن کی وجہ سے انسانیت کمزور اور ایمان وعقیدہ اور اخلاق تباہ و برباد ہوتے ہیں۔ یہ مذہب انسان کو غلط عقائد اور اوہام وخرافات سے محفوظ رکھتا ہے۔ جو شیطانی تصرفات کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ قرآن مجید نے فرعون اور اس کے درباریوں کے اس غلط عقیدہ کی بھرپور تردید کی جس میں فرعون نے حضرت موسیٰؑ اور ان کے متبعین (پیروکاروں) کو اپنے حق میں نامبارک منحوس اور برا تصور کیا اور ان لوگوں سے برا اور بدفال لیا۔

فإذا جاء تهم الحسنة قالوا لنا هذه وإن تصبهم سيئة يطيروا بموسى ومن معه ألا إنما طائرهم عند الله ولكن أكثرهم لا يعلمون (الاعراف آية: ۳۱) (ترجمہ) پھر جب پہنچی ان کو کوئی بھلائی کہنے لگے یہ ہمارے لائق ہے۔ اور اگر پہنچی برائی تو نحوست بتلاتے موسیٰؑ کی اور ان کے ساتھ والوں کی۔ سن لو! ان کی شومیٔ تو اللہ کے پاس ہے۔ پر اکثر لوگ نہیں جانتے۔

مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''لفظ طائر کے لغوی معنی پرندے جانور کے ہیں۔ عرب پرندہ جانوروں کے داہنی بائیں جانب اترنے سے اچھی بری فالیں لیا کرتے تھے۔ اس لئے مطلق فال کو بھی طائر کہنے لگے۔ اس آیت میں طائر کے یہی معنی ہیں۔ اور مطلب آیت کا یہ ہے کہ ان کی فال اچھی یا بری جو کچھ بھی ہو وہ سب اللہ کے پاس ہے جو کچھ اس عالم میں ظاہر ہوتا ہے سب اللہ کی قدرت وخشیت سے عمل میں آتا ہے، نہ اس میں کسی کی نحوست کا دخل ہے نہ برکت کا، یہ سب ان کی خام خیالی اور جہالت ہے جو پرندوں کے داہنے یا بائیں اڑ جانے سے اچھی بری فالیں لے کر اپنے مقاصد اور عمل کی بنیاد اس پر رکھتے ہیں۔ (معارف القرآن سورۂ اعراف)

اسلام کا بنیادی عقیدہ

توحید اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے۔ توحید کا مطلب اور مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ایک ماننا، اللہ تعالیٰ کو ایک ماننے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے اعتبار سے یکتا ہے اور اپنے اختیار وصفات میں بھی یکتا ہے۔ خدا کا کوئی خاندان اور کنبہ نہیں ہے اور نہ اس کے لئے اولاد اور اعزہ واقارب ہیں، موت وحیات کی کلید اس نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہے رزق دینا، رزق میں تنگی و وسعت کرنا، رزق سے محروم کرنا، نفع ونقصان سے دوچار کرنا، فتح وکامیابی شکست و ناکامی سب اسی کے حکم سے وابستہ ہے۔ انسان جب توحید پرست بن جاتا ہے اور اس کا یہ عقیدہ اور تصور ہوجاتا ہے کہ دنیا اور دنیا کی ساری چیزوں کا وہ تنہا مالک ہے اور پوری دنیا اسی کے تصرف میں ہے ایک پتا بھی بغیر اس کی مرضی کے ہل نہیں سکتا تو توحید کا یہ تصور اور عقیدہ انسان کو در در کی ٹھوکریں کھانے اور ہر جگہ سر جھکانے سے بچاتا ہے اور بندوں کی غلامی سے نکال کر ایک خدا کی غلامی تک پہنچاتا ہے۔

اہل عرب کی خرافات اور آنحضرت ﷺ کی اصلاح عقائد کی کوششیں

آنحضرت ﷺ کی جس زمانے میں اور جس ماحول میں بعثت ہوئی اور جن ناگفتہ بہ ماحول میں اور جرأت آزما دور میں تشریف لائے اس کی تاریخ مخفی اور پوشیدہ نہیں۔ اہل عرب کے عقائد وخیالات سراسر شیطانی تلبیسات کا نتیجہ تھے۔ عرب کا ہر خاص وعام اوہام وخرافات کے دلدل میں پھنسا ہوا تھا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ جب کوئی کسی کو قتل کر دیتا ہے تو مقتول کی روح پرندے کی شکل اختیار کر کے اس کی قبر پر بیٹھ جاتی ہے، اور قبر کی مٹی کریدتی ہے اور مقتول کو آمادہ کرتی ہے کہ اٹھو اور اپنے قاتل سے بدلہ لو۔

ایسے ہی ان کا عقیدہ تھا کہ بیماری بغیر تقدیر الٰہی کے اپنے آپ ایک دوسرے کو پہنچ جاتی ہے۔ اس طرح جاہلیت نے ماہ صفر کو نامرادی وناکامی کا پیش خیمہ بتایا تھا۔ اس مہینہ میں کسی اہم کام کرنے کو اہل عرب اپنے حق میں مصیبت خیال کرتے تھے۔ بلکہ ماہ صفر کے تعلق سے ان کے یہاں یہ عقیدہ پایا جاتا تھا کہ وہ ایک قسم کا سانپ ہے جو انسان کے معدہ میں پرورش پاتا ہے۔ اور بھوک کی شدت میں جو تکلیف محسوس ہوتی ہے اس کی اصل وجہ وہی سانپ ہے جو انسان کو ڈستا ہے۔ اس مہینہ کے بارے میں ان کا یہ بھی خیال تھا کہ اس مہینہ میں جو کاروبار ہوگا نقصان سے دوچار ہوگا، جو سفر ہوگا وہ نامراد ہوگا۔ جو شادی ہوگی وہ ناکام ہوگی۔

عربوں میں ایک خیال یہ تھا کہ صحراء اور جنگلوں میں کچھ شیاطین ہوتے ہیں، جو رنگ بدلنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور راہ گیروں کو راستہ سے بھٹکانے کا کام کرتے ہیں، عرب اس کو ''غول'' کہا کرتے تھے۔

عرب شوال کے مہینہ کو بھی نامبارک اور شادی بیاہ کے لئے ناموزوں تصور کرتے تھے، اسی طرح اہل عرب بدھ کے دن کو اپنے حق میں منحوس خیال کرتے تھے، کوے کے بولنے اور الو کے مکان پر بیٹھنے سے بدفالی لیتے تھے، اگر الو کسی گھر پر بولتا تو کہتے یہ اطلاع دے رہا ہے کہ تمہارے گھر کوئی مصیبت آنے والی ہے اور کسی شخص کی موت ہونے والی ہے۔ وہ لوگ جب سفر کرتے تو پرندہ کو اڑایا جاتا، اگر دائیں جانب اڑتا تو اسے نیک فال تصور کرتے اور سفر کرتے اور اگر بائیں طرف سے اڑتا تو بدفالی لیتے اور سفر سے گریز کرتے۔

مذہب اسلام میں بھلا اس قسم کے خیالات کو کہاں جگہ مل سکتی تھی چنانچہ آپؐ نے ان باطل عقائد وخیالات اور اوہام وخرافات کی کھلے طور پر تردید کی اور ان پر قدغن (روک) لگایا اور ارشاد فرمایا: ان چیزوں کی کوئی حقیقت نہیں۔

اسلام میں نحوست و بدفالی کی کوئی جگہ نہیں: آپؐ نے ایسے تمام تصورات اور خرافات کی تردید فرمائی اور اہل ایمان کو ان سے بچنے کی تلقین فرمائی۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا: لا عدوی ولا طیرۃ ولا ھامۃ ولا صفر دوسرے کو بیماری لگنے، پرندہ سے بدفالی لینے اور ماہِ صفر کو منحوس

سمجھنے کی کوئی حقیقت نہیں۔

گویا آپؐ نے اس حدیث کو بیان فرما کر زمانۂ جاہلیت کے تمام خرافات اور شیطانی تلبیسات کا قلع قمع فرمادیا اور امت کو یہ تعلیم اور سبق سکھایا کہ سب کچھ قدرت کی طرف سے ہوتا ہے، کوئی اس کی قدرت سے باہر نہیں، اسی طرح موت، آنا نہ آنا خدا کی قدرت اور اس کے علم میں ہے وہی جانتا ہے کہ کس کی موت کب اور کہاں آئے گی۔ "اعلم الغیب فلا یظهر علی غیبه أحداً" اللہ ہی مغیبات کا جاننے والا ہے، اپنی غیب کی باتوں پر کسی کو مطلع نہیں کرتا۔ قل لا أملك لنفسی نفعاً ولا ضراً إلا ما شاء الله ''کہہ دیجئے آپ کہ میں اپنی ذات کے نفع ونقصان کا مالک نہیں مگر جتنا اللہ چاہے''

حدیث نبوی اور آیات مذکورہ صاف بتلا رہی ہیں کہ اٹکل اور تخیل کرنا سراسر گمراہی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ عرب شوال میں شادی کو اچھا نہیں سمجھتے اور میرا نکاح شوال ہی میں ہوا۔ اور نکاح بہت بہتر اور کامیاب ہوا۔ حضرت عکرمہؓ کہتے ہیں کہ ایک روز ہم حضرت ابن عباسؓ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ کہ ایک چڑیا بولتے ہوئے سامنے سے اڑتی ہوئی گذری ایک شخص نے کہا: "خیر خیر" یعنی کوئی اچھی بات پیش آنی والی ہے۔ تو حضرت ابن عباس نے کہا چڑے چڑیوں کا بولنا نہ بھلائی کی خبر دیتا ہے اور نہ کسی مصیبت کی۔ یہ محض وہم ہے۔ طاؤسؒ اپنے شاگرد کے ساتھ سفر میں جارہے تھے کہ کوّا بولا، شاگرد نے کہا کوئی اچھی بات پیش آنے والی ہے تو حضرت طاؤسؒ نے ڈانٹا اور کہا تم میرا ساتھ چھوڑ دو۔

بدفالی کس درجہ میں ممنوع ہے اس سلسلے میں خود فرمان نبویؐ موجود ہے، ایک صحابی جن کا نام معاویہ ابن الحکمؓ ہے انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا تھا کہ ہم میں سے بہت سے ایسے ہیں جو فال لیا کرتے ہیں تو آپؐ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص اس قسم کا خیال اپنے دل میں کھٹکتا ہوا پائے تو اسے جمنے نہ دے۔

فضل ابن عباسؓ سے آپؐ نے فرمایا: انما الطیرة ما امضاك أو ردك بدفالی وہ ہے جس کی بنا پر تم کوئی کام کر گذرو یا کوئی کام کرنا ہو تو اس کی وجہ سے کرنا چھوڑ دو۔ یعنی کسی شخص نے بدفالی لی پھر اس کی وجہ سے کسی کام کو کرنا ضروری سمجھے یا اس کا نہ کرنا ضروری سمجھے، البتہ ایسے خیالات کہ جن کا اثر کسی کام اور اعتقاد پر نہ پڑے تو کوئی حرج نہیں۔ اسی طرح کسی چیز سے نیک فال لینا جس کی وجہ سے طبیعت میں سرور انبساط اور طمانیت پیدا ہو جائز ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ اسلام میں عدوی وطیرہ نہیں ہاں مجھے نیک فال اچھی معلوم ہوتی ہے صحابہ کرامؓ عرض کیا کہ نیک فال کیا ہے؟ آپ نے فرمایا اچھے کلمے جن سے طبیعت مطمئن ہو۔

علامہ ابن قیمؒ نیک فال کے سلسلے میں لکھتے ہیں۔ نیک فال کوئی شرک نہیں ہے بلکہ یہ ایک طبعی تقاضا ہے اور تقاضائے انسانی ایسی چیز کی طرف مائل ہوتا ہے جو اس کے موافق ہے۔

اوہام پرستی ایک طرح کی غلامی ہے

اوپر جن تفصیلات کو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی روشنی میں پیش کیا گیا اس سے یہ بات صاف ظاہر ہوگئی کہ اسلام ان تمام اوہام وخرافات کا منکر ہے، مذہب اسلام میں اس طرح کے تصورات اور عقیدہ کی کوئی اہمیت نہیں ہے بلکہ اس کو کفر اور شرک سے تعبیر کرتا ہے اور منافی اسلام سمجھتا ہے۔

آج سے چودہ سو سال پہلے ہی اسلام نے توحید کے عقیدہ کو لوگوں کے ذہن میں اس طرح راسخ کر دیا کہ وہ اس قسم کے تصور کو اپنے سے قریب بھی پھٹکنے نہیں دیتے تھے۔ اسلام اوہام پرستی کی کسی بھی شکل اور صورت میں ہمت افزائی نہیں کرتا بلکہ اوہام پرستی کو ایک طرح کی غلامی سے تعبیر کرتا ہے کہ آدمی اپنے پاؤں کی ٹھوکروں میں رہنے والی چیزوں سے ڈرنے اور خوف کھانے لگے اور اس سے اپنے نفع ونقصان کو وابستہ کرلے، جو شخص عقیدۂ توحید سے محروم ہو اور خدا پر اس کا یقین کامل نہ ہو مشکل ہے کہ وہ اس غلامی سے آزاد ہو سکے۔

لیکن اس کے برعکس جو شخص جتنا بڑا توحید پرست ہوگا اور

اللہ تعالیٰ پر اس کا جتنا زیادہ ایمان ہوگا وہ اسی قدر اوہام پرستی کی مصیبت سے آزاد اور توہمات کا اسیر بننے سے محفوظ رہے گا۔

مضبوط ایمان اور عقیدے کی چند مثالیں

حضرت نیرہؓ ایک صحابیہ ہیں۔ ایمان لائیں، لوگوں نے اتنا ظلم کیا کہ آنکھوں کی بینائی جاتی رہی، لوگ کہنے لگے کہ دیویوں، دیوتاؤں کو برا بھلا کہنے اور ان کا انکار کرنے کی وجہ سے بینائی سے محروم ہوگئی ہے، ہمارے زمانہ میں عورتیں تو کیا مرد بھی، اور جاہل اور ان پڑھ کیا، پڑھے لکھے لوگ بھی ایسے موقعوں پر اوہام وخرافات میں گرفتار ہوجاتے ہیں۔ لیکن حضرت نیرہؓ کی فکر میں ذرا بھی تزلزل نہیں آیا کہ ان کی صرف بصارت اللہ نے لی تھی، اور وہ ایمان اور ایمانی بصیرت سے محروم نہیں ہوئی تھیں۔

حضرت زنیرہؓ کہتی ہیں کہ سب اللہ کے فیصلہ اور اس کے حکم سے ہے۔ آنحضرت ﷺ ان کی استقامت اور ثابت قدمی سے بہت خوش ہوئے اور ان کے لئے دعا فرمائی، چنانچہ پھر ان کی بصارت لوٹ آئی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جب مصر کا علاقہ فتح ہوا، مصر کی معیشت کا مدار دریائے نیل پر تھا، یہاں معمول تھا یہ دریا جب خشک ہوجاتا تو ایک کنواری لڑکی کو دلہن بنا کر دریا کے بیچ میں ڈال دیا جاتا، دریا کی بلا خیز موجیں اٹھتیں اور اسے موت کی نیند سلانے کے بعد جاری ہوجاتیں، جب مصر کے خلافت اسلامیہ کے زیر نگیں آنے کے بعد دریا خشک ہوا اور گورنر مصر حضرت عمرو ابن عاصؓ کو اس واقعہ کی اطلاع ملی تو انہوں نے اولا تو انکار کیا، پھر لوگوں کے اصرار پر مشورہ کے لئے خلیفۂ راشد حضرت عمرؓ کو خط لکھی، حضرت عمرؓ نے اپنے جواب کے ساتھ ایک اور تحریر دریائے نیل کے نام لکھا اور ہدایت دی کہ اس تحریر کو دریائے نیل میں ڈال دیا جائے، حضرت عمرؓ نے اپنی اس تحریر میں دریا کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اگر تو اللہ کے حکم سے جاری ہے تو میں دعا کرتا ہوں کہ تو جاری ہوجائے اور اللہ کے حکم سے جاری نہیں ہے تو ہمیں تیری ضرورت نہیں، حسبِ ہدایت یہ تحریر دریا میں ڈال دی گئی اور دریائے نیل اس شان سے جاری ہوا کہ دوسرے دن (جو ہفتہ کا دن تھا) سولہ ہاتھ پانی ہوگیا (البدایہ والنہایہ: ۱۰۰/۷) اور پھر آج تک کبھی نہیں تھما۔

اسی طرح کا واقعہ ہندوستان کے ساحلی علاقہ میں پیش آیا جس کا تذکرہ ابن بطوطہ نے اپنے سفر میں کیا ہے کہ یہاں کے لوگ کافر تھے، یہاں ہر ماہ شیطان وارد ہوتا، اس کے لئے سمندر کے کنارے ایک بت خانہ بنا دیا تھا، جو ''بدخانہ'' کہلاتا تھا، جو دن شیطان کی آمد کا دن ہوتا، لوگ اس دن ایک کنواری لڑکی سنوار کر اس بدخانہ میں بٹھا لیتے، رات میں وہیں چھوڑ دیتے، جب صبح کو آتے تو اسے اس حال میں پاتے کہ وہ مردہ ہوتی، اور کنواری نہ ہوتی، اتفاق سے یہاں ایک مغربی تاجر ابو البرکات بربری جو حافظ قرآن تھے، آئے ہوئے تھے، وہ ایک بوڑھی خاتون کے مہمان تھے، ایک دن جب اپنے میزبان کے یہاں پہنچے تو دیکھا کہ خلاف معمول وہ بوڑھی خاتون بہت سی عورتوں کے ساتھ مصروفِ گریہ وبکا ہے، ایک ترجمان کے واسطہ سے صورت دریافت کی تو معلوم ہوا کہ شیطان سے بچاؤ کے لئے آج اس کی اکلوتی بیٹی کے نام کا قرعۂ فال نکلا ہے۔

شیخ ابو البرکات کو داڑھی نہ تھی، انہوں نے پیشکش کی کہ آج اس لڑکی کی جگہ وہ جائیں گے، چنانچہ وہ بدخانہ میں بیٹھ گئے اور قرآن کی تلاوت کا سلسلہ جاری رکھا، اسی طرح پوری رات گذری، جب معمول کے مطابق لوگ صبح میں تحقیق حال کے لئے پہنچے تو دیکھا کہ زندۂ وسلامت ہیں اور تلاوت میں مصروف ہیں، خبر شدہ شدہ پورے علاقہ میں پھیل گئی اور علاقے کے راجہ تک اطلاع پہنچی، ابن بطوطہ نے اس کا نام ''شنوازہ'' لکھا ہے، عجب نہیں کہ یہ ''وشنوراجہ'' کی بدلی ہوئی صورت ہو، شیخ نے راجہ پر بھی اسلام پیش کیا، اس نے کہا کہ آئندہ ماہ تک میرے پاس رہو، اگر آئندہ مہینہ میں بھی تم یہی عمل کرکے دکھاؤ اور ہم لوگوں کو اس شیطان کی ابتلاء سے بچا سکو تب ہم ایمان لے آئیں گے، اگلے ماہ بھی یہی واقعہ

پیش آیا، چنانچہ راجہ مسلمان ہوگیا اور راجہ کے ساتھ رعایا کے اکثر لوگ بھی مسلمان ہوگئے۔(رحلہ ابن بطوطہ:۱/۹۰/۵۸۹)

سچائی یہ ہے کہ اگر ایمان مضبوط و مستحکم اور انسان کا عقیدہ درست اور قوی ہو، اللہ تعالیٰ سے نفع ونقصان کا سچا یقین ہو تو ایک جاہل اور ان پڑھ شخص بھی اپنے آپ کو اوہام وخرافات میں پڑنے سے بچا سکتا ہے۔

چنانچہ تاریخ کی کتاب میں درج ہے کہ تیمور لنگ جو کوئی عالم وفاضل حکمراں نہیں تھا۔لیکن جب اس نے دریائے جمنا کو عبور کرنا چاہا تو جیوتشوں نے منع کیا اور کہا کہ یہ گھڑی منحوس ہے۔ تیمور نے اس کو کوئی اہمیت نہیں دی اور کہا کہ ہم ارباب توحید ایسی باتوں پر یقین نہیں رکھتے، یہ تو مشرکین اور تثلیث پر ایمان رکھنے والوں کا عقیدہ ہے۔(عصر حاضر کے سماجی مسائل صفحہ ۲۳)

باطل عقائد و خرافات اور ہماری ذمہ داریاں: لیکن افسوس ہے کہ زمانۂ جاہلیت کی بہت سی رسمیں آج مسلم معاشرہ میں پائی جاتی ہیں اور اس کا لحاظ اتنا کیا جاتا ہے کہ جاہلیت بھی شرما جائے۔ اس ملک میں رہتے ہوئے جہاں ہم نے برادران وطن سے زندگی کے دوسرے شعبوں اور سماجی رسوم وروایات میں ہندو معاشرت کا اثر قبل کیا ہے، وہیں فکر وعقیدہ کے باب میں ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔

چنانچہ بہت سے مسلمان بھی جب کہیں جانے لگتے ہیں اور راستے میں کوئی پوچھ لے کہ کہاں جارہے ہو؟ یا چھینک دے تو افسوس کہ بہت سے مسلمان بھی اسے اپنے حق میں برا سمجھتے ہیں اور سفر کو ملتوی کردیتے ہیں یا کبیدگی دل کے ساتھ سفر کرتے ہیں اکثر مسلمان بھی صبح کے وقت ادھار بیچنے اور خصوصاً پہلے گاہک کو ادھار دینا بدفالی سمجھتے ہیں، بعض علاقوں میں ہندوؤں کے ساتھ مسلمان بھائی بھی شام کے وقت چونا کا لفظ نہیں بولتے۔تو بعض علاقوں میں دکان بند کرتے وقت ادھار سامان فروخت نہیں کرتے۔اسی طرح صفر المظفر میں ''تیرہ تیزی'' کا وہمی تصور بھی مسلم گھرانوں میں پایا جاتا ہے۔جو مردوں میں تو کم لیکن عورتوں میں یہ وہم وتصور زیادہ پایا جاتا ہے۔صفر کے شروع کے تیرہ دن انتہائی منحوس خیال کئے جاتے ہیں، شادی بیاہ نہیں کی جاتی دلہن کی رخصتی موقوف کردی جاتی ہے۔ان ایام میں کوئی نیا کام کرنے سے گریز کیا جاتا ہے۔ ولادت کو بھی اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا، آنے والے مہمان کو منحوس ونامبارک سمجھا جاتا ہے۔اور اگر کوئی حادثہ پیش آتا ہے تو اس سے مولود کو جوڑ دیا جاتا ہے۔

اسی طرح اگر کسی بہو کے گھر میں آنے کے بعد سسرال میں کسی کا انتقال ہوجائے تو اس کو منحوس تصور کیا جاتا ہے۔

بعض مسلم گھرانوں میں بھی گھر کی تعمیر شروع ہوتی ہے تو ناریل پھوڑے جاتے ہیں۔حد یہ ہے کہ اب بعض مسلمان بھی عقدِ نکاح کے وقت اور شادی کے جوڑوں کے سلسلے میں عاملین سے مشورہ لیتے ہیں، گویا جس غلامی سے اسلام نے آزاد کیا تھا خود ہی اپنے آپ اس میں مبتلا ہوتے ہیں۔

اسلام کی نگاہ میں کوئی وقت منحوس نہیں ہے، آنحضرت ﷺ نے بعض مہینوں، راتوں اور گھڑیوں کو مبارک ضرور قرار دیا، لیکن کوئی وقت اور گھڑی نامبارک نہیں۔رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر کسی میں نحس ہوتا تو تین چیزوں میں ہوتا، عورت گھر اور سواری، اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی چیز میں نحس ہے ہی نہیں۔ یہ مشرکانہ تصور ہے کہ انسان اللہ کے بجائے ایسی چیزوں سے نفع اور نقصان کو جوڑ لے۔

الغرض سعد ونحس اور بدفالی کا تصور قطعاً اسلامی تصور نہیں ہے۔جو کچھ ہوتا ہے صرف اللہ کی طرف سے ہوتا ہے، اس کے حکم میں کسی کو اختیار نہیں، وہ ہر چیز پر قادر ہے، ایک مسلمان کی یہ شان ہے کہ اس کا باطن وہمی تصورات سے قطعاً پاک ہو اور ظاہر طاعت ربانی شاہد ہو، پھر اس کو وہ قوت قاہرہ حاصل ہوگی جو کسی قوم وملت کی قیادت کے لئے ضروری ہے۔

یقین پیدا کر اے غافل کہ مغلوب گماں تو ہے۔

☆☆☆

اسلامی تعلیمات

معاشرے پر اسلامی سزاؤں کے اثرات

کفیل احمد ندوی
استاذ مدرسہ دارالتعلیم والصنعت جاجمؤ، کانپور

دشمنانِ دین وشریعت کی طرف سے شریعتِ اسلامیہ کے جس حصہ پر سب سے زیادہ اعتراضات ہوتے ہیں وہ حدود وتعزیرات (مختلف جرائم کی سزاؤں) کا حصہ ہے، اسلامی شریعت میں بعض سنگین جرائم کی سزائیں قدرے سخت طے کی گئی ہیں، زِنا کی سزا رجم یا ۱۰۰ کوڑے، شراب نوشی اور کسی پر تہمت کی سزا ۸۰-۸۰ کوڑے، چوری کی سزا قطع ید، اور دیگر جرائم کی سزائیں جو اسلامی شریعت کا ایک ناقابلِ انکار حصہ ہیں۔ آج مختلف قومی و عالمی شخصیات، حلقوں اور اداروں کی طرف سے یہ مطالبات سامنے آتے رہتے ہیں کہ ان سزاؤں کو ساقط کر دیا جائے، کیونکہ یہ سزائیں انتہائی ظالمانہ، غیر مہذب اور انسانیت سوز ہیں۔

ان سزاؤں کے خلاف کچھ اس طرح غلط فہمی پیدا کی جاتی اور شکوک وشبہات کا اظہار کیا جاتا ہے کہ اچھے اچھے باشعور، یہاں تک کہ بہت سے دیندار لوگ بھی اسلام کے فوجداری نظام کو غلط سمجھنے لگتے ہیں[۱]، عوام کو یہ تأثر دیا جاتا ہے کہ زِنا کوئی بھی کرے، کسی بھی جگہ کرے بس اسلام زانی پر کوڑے برسانے یا اسکو سنگسار کرنے کا حکم دیتا ہے، چوری کوئی بھی کرے، چاہے اس کے حالات کیسے بھی ہوں، بس اسلام چور کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیتا ہے، شراب کوئی بھی اور کسی بھی جگہ پیئے لیکن اسلام اس شرابی کو بھی سخت سزا دینے کا حکم دیتا ہے، کیونکہ اسلام کی یہی منشا ہے اور اس کا یہی کمال ہے!۔

اپنے اور پرائے اس گمراہ کن فریب ہی کا شکار ہو کر اسلام سے متنفر ہونے لگتے ہیں، انکی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اسلام ایک مکمل نظام ہے، اسکو من حیث الکل جاننے اور سمجھنے کی ضرورت ہے، اور دوسری شرعی حدیں صرف اسی جگہ نافذ کرنے کیلئے مقرر کی گئی ہیں جہاں مملکت کا نظم ونسق اسلامی اصولوں پر ہو، اور تہذیب وتمدن و معاشرت کی عمارت اسلامی اصولوں پر اٹھائی گئی ہو۔

اسلامی قانون فوجداری کو سمجھنے میں دقّت اِسی لئے ہوتی ہے کہ لوگ اپنے پیشِ نظر تو رکھتے ہیں معاشرے کے اس بیہودہ نظام کو جو آج دنیا میں قائم ہے، اور اسلامی سزاؤں کا موازنہ اپنے اسی فاسد ومجرمانہ ماحول سے کرتے ہیں جہاں جرائم کے ارتکاب کے بے شمار طاقتور عوامل ومحرکات پائے جاتے ہیں، ظاہر ہے کہ ایسے میں اسلامی سزائیں ظالمانہ ہی نظر آئیں گی۔

اس لئے اس بات کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ اسلام اِن شرعی سزاؤں کی تنفیذ سے پہلے کیسی سوسائٹی پیدا کرتا ہے، جرائم کے انسداد کیلئے کس طرح کی تدابیر اختیار کرتا ہے، اور خود اِن سزاؤں کی تنفیذ کیلئے کونسی اور کتنی شرائط وقیود لگی ہوئی ہیں۔ اس مکمل قانونی عمل کے بعد اگر ان شرعی حدود کو نافذ کیا جائے تو معاشرے پر کیسے اثرات مرتب ہوں گے؟ اس

مضمون میں انہیں باتوں کا جائزہ لیا گیا ہے، تاکہ ان سزاؤں کے مقاصد وفوائد اور ان کی حکمت واثرات سے واقفیت پیدا ہو۔

سزاؤں کی تقسیم

اسلام نے معاشرے کو ہر طرح کے جرائم سے پاک بنانے کیلئے جو سزائیں مقرر کی ہیں انکی تین قسمیں ہیں۔

(۱) **تعزیرات** :- تعزیرات میں صغائر اور معمولی گناہوں کی سزائیں شامل ہیں، جیسے والدین کی نافرمانی، نماز چھوڑنے، چغلی کھانے، مال میں اسراف وفضول خرچی کرنے، ناپ تول میں کمی، وقت کو بیہودہ کاموں میں ضائع کرنے، غیر محرم کے ساتھ اختلاط کی سزائیں، غرض کہ تعزیرات میں ہر اس جرم کی سزا شامل ہوسکتی ہے، جسکو باقاعدہ شریعت کی طرف سے طے نہ کیا گیا ہو[۲]، تعزیری (ہلکی سزاؤں) کی تعیین کو قاضی وحاکم کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے، قاضی جرم، مجرم اور اس کے ماحول پر غور کرکے جس قدر سزا کو جرم کی روک تھام کے لیے ضروری سمجھے وہ سزا دے سکتا ہے[۳]۔

(۲) **قصاص** :- کچھ جرائم ایسے ہیں جن کی سزاؤں کو قصاص کا نام دیا گیا ہے، قصاص کے لغوی معنیٰ ''برابری، مماثلت وتسویہ'' کے ہیں[۴]، قصاص کو قصاص اس لئے کہا گیا ہے کیونکہ اس میں مجرم وظالم کو اس کے جرم کے برابر بدلہ دیا جاتا ہے[۵]، قرآن میں قصاص کو لوگوں کی زندگی کی بقا وقیام کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے[۶]، اگر کسی نے دوسرے کو جان بوجھ کر قتل کیا تو بدلہ میں قاتل کو قتل کیا جائیگا، کسی نے کسی کا دانت توڑا، آنکھ پھوڑی، ناک توڑی، غرض کہ جسم کے جس حصہ کو بھی نقصان پہونچایا تو بدلہ میں اسکے اسی حصہ کو نقصان پہونچایا جائیگا[۷]۔

(۳) **حدود**:- حد کے لغوی معنیٰ ''روک ٹوک'' کے ہیں، ایسی چیز جو دو چیزوں کو ملنے سے روک دے اسکو حد کہیں گے[۸]، دربان کو حدّاد اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ وہ انسان کو اندر آنے سے روکتا ہے، کسی بڑے جرم پر ملنے والی سزا کو حد اس لئے کہتے ہیں کیونکہ وہ مجرم کو اعادۂ جرم سے باز رکھتی ہے[۹]، علامہ راغب اصفہانی کہتے ہیں کہ ''حدود کا اطلاق معاصی پر بھی ہوتا ہے'' **تلک حدود الله فلا تقربوها**[۱۰]۔

شرعی تعریف :- کسی بھی جرم پر ملنے والی وہ سزا جسکو خود اللہ تعالیٰ نے اپنا حق قرار دیا ہو اور اسکو طے کردیا ہو، اور اب کسی کو بھی اس سزا کے ختم کرنے کا حق نہیں ہے[۱۱]، حدود میں کونسے جرائم داخل ہیں، اس سلسلہ میں علماء کے درمیان اختلاف ہے، بعض علماء نے ۱۷ جرائم کو حدود میں شامل مانا ہے[۱۲]، لیکن چار جرائم کو متفقہ طور پر حدود میں شامل مانا گیا ہے، کیونکہ ان کی سزائیں صراحۃً کتاب وسنت سے ثابت ہیں، (۱) زنا کی سزا بعض صورتوں میں ۱۰۰ کوڑے اور بعض صورتوں میں سنگسار کرکے قتل کردینا ہے، بعض علماء لواطت کو بھی حد زنا میں شامل کرتے ہیں[۱۳]، (۲) حد سرقہ، چوری کی سزا یہ ہے کہ پونچھے پر سے ہاتھ کاٹ دیا جائے[۱۴]، (۳) حد قذف، کسی پاکدامن مرد وعورت پر زنا کی تہمت لگانے کی سزا ۸۰ کوڑے بیان کی گئی ہے[۱۵]، (۴) حد خمر، شراب پینے کی سزا صحابہ کرام کے مشورے سے ۸۰ کوڑے مقرر کی گئی ہے[۱۶]، یہ چار جرائم ایسے ہیں جنکی سزائیں کتاب وسنت میں طے کردی گئی ہیں، اور انکو کسی قاضی وامیر کی رائے پر نہیں چھوڑا گیا ہے، اس مضمون میں ان ہی جرائم کے بارے میں اسلام کے نقطہ نظر، ان کے نتائج واثرات، اور ان سزاؤں کی حکمتوں، فوائد واثرات کا ایک جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے، اور سب سے پہلے زنا کے تعلق سے گفتگو کو مناسب خیال کیا گیا ہے۔

اسلام کا کمال دوسرے وضعی ومصنوعی قوانین کے برخلاف یہ ہے کہ وہ جرائم کے انسداد کے لئے صرف سزا پر اکتفا نہیں

کرتا، بلکہ اسلام جرائم کے انسداد کے لئے سب سے پہلے اخلاقی راستہ اختیار کرتا ہے، جرم کے اسباب ومحرکات، تمہیدات وتقریبات کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر ختم کرتا ہے، جرم کی قباحت وشناعت کو ذہن نشین کرتا ہے۔

یہی معاملہ زنا کے سلسلہ میں بھی ہے، اسلام سب سے پہلے انسان کے شعور ووجدان، اس کے جذبات واحساسات کی تربیت کرتا ہے، اس کے دل میں عالم الغیب اور ہمہ گیر طاقت کے مالک خدا کا خوف اجاگر کرتا ہے، اسے آخرت کی باز پرس کا احساس دلاتا ہے، اس کے اندر قانون الٰہی کی اطاعت کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔

اسکو بار بار یہ یاد دلاتا ہے کہ اسکو ملنے والی ارادہ وخیال کی آزادی بے لگام نہیں ہے، بلکہ یہ آزادی مشروط ہے، اگر اسکا درست استعمال کیا تو دنیا وآخرت میں اچھے نتائج حاصل ہوں گے، اور غیر مناسب استعمال سے اسکا بھی نقصان ہوگا اور معاشرے پر بھی منفی اثرات مرتب ہوں گے، اوران تمام اسباب ووسائل، عوامل ومحرکات کو بھی ختم کر دیتا ہے، جو زنا کی تقریب وتمہید ہو سکتے ہوں، حد زنا سے پہلے وسیع ہمہ گیر اصلاحی وانسدادی تدابیر اختیار کرتا ہے [۱۶]، قرآن میں فرمایا گیا ہے، ''ولا تقربوا الزنا'' [۱۸]، زنا کے قریب بھی مت جانا، قرآن کے ان فقروں میں بڑی معنویت ہے، یہ نصیحت جس خوبصورت انداز سے کی گئی ہے دنیا کے دیگر قوانین اس حکم الٰہی کے سامنے گرد ہیں، یہاں یہ نہیں فرمایا گیا کہ تم زنا نہ کرنا، بلکہ یہ کہ زنا کے قریب بھی مت جانا، مطلب یہ ہے کہ ایسے تمام کاموں سے مردوں اور عورتوں کو بچنا چاہئے جو ارتکاب زنا کا ذریعہ بن سکتے ہوں، زیب وزینت کا مظاہرہ، گندے اشعار کا پڑھنا یا سننا، کسی غیر محرم کی طرف للچائی ہوئی نظروں یا بے حیائی کے ارادے سے دیکھنا، تنہائی میں کسی عورت ولڑکی سے ملنا، بات کرنا، بے وجہ اس کے بدن کو چھونا یا اور کسی طرح اسکی بات چیت اور آمد ورفت سے ناجائز لطف اٹھانا، یہ سب باتیں اسلام میں حرام ہیں [۱۹]، وہ مرد وعورت کو حکم دیتا ہے کہ نگاہیں نیچے رکھیں [۲۰]، پردے کا اہتمام کریں [۲۱]، عورتیں غیروں کو اپنے اندر کا بناؤ سنگار نہ دکھائیں اپنے زیور کی جھنکار کسی کو نہ سنائیں، زمین پر آہستہ چلیں، جسم پر خوشبو نہ ملیں، بیچ راستہ سے ہٹ کر کترا کر چلیں، مرد وعورت راستہ میں باتیں نہ کریں [۲۲]، غرض کہ ہر ایسا کام جو بے محل نفسانی جذبات ابھارتا، اور جنسی آوارگی پیدا کرنے کا سبب ہو، وہ سب کھلی بے حیائی میں شامل ہے اور اس سے بچنے کا حکم ہے [۲۳]، ان تعلیمات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اسلام کس طرح کا شاندار، صالح، وصحت مند معاشرہ تیار کرنا چاہتا ہے، جہاں امن وسکون ہو، کسی کو بھی اپنی عزت و ناموس کے بارے میں کوئی خطرہ نہ ہو، جسکے مرد وعورت اپنے اپنے فرائض و ذمہ داری کو خوشدلی سے پورا کرتے ہوں، اس کے لئے اسلام انسانی فطرت وضرورت کا لحاظ کرتے ہوئے ، جائز طریقہ سے جنسی ضرورت کو پورا کرنے، اور توالد وتناسل کا سلسلہ قائم کرنے کے لئے نکاح وشادی کا طریقہ عطا کرتا ہے، نکاح کی فضیلت کو بیان کرتا ہے [۲۴]، بعض حالات میں اسکو ضروری قرار دیتا ہے [۲۵]، اگر کسی کے پاس گھر بسانے کے وسائل نہ ہوں تو اسلامی معاشرے کے افراد کو حکم دیتا ہے کہ ایسے شخص کے نکاح کا انتظام کریں۔

ان تمام آسانیوں کے بعد، ان تمام بندشوں کو توڑ کر بھی اگر کوئی زنا کاری کرتا ہے، کسی کی عزت وناموس پر ہاتھ ڈالتا ہے، کسی معصوم لڑکی وعورت کے ساتھ حیوانیت و درندگی کا کھیل کھیلتا ہے، تو پھر ایسے انسان کا کیا کیا جائے؟ اسکو کیا سزا دی جائے؟ ان تمام آسانیوں کے ہوتے ہوئے اس نے یہ غیر انسانی حرکت کیوں کی؟ کیا اسکا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس انسان کی فطرت مسخ ہو چکی ہے؟ اسکی انسانیت کو

زنگ لگ چکا ہے، کیا یہ اب کسی سزا کا مستحق نہیں ہے؟ کیا پورے معاشرے کے امن وسکون اور مظلوم کو انصاف دلانے کی خاطر اسکو عبرت انگیز سزا دینا ظلم ہے؟ کیا اس میں انسانیت کی توہین ہے[۲۶]؟

اس کے ساتھ ساتھ اگر زنا کے تباہ کن نقصانات و دوررس اثرات پر ایک نظر ڈال لی جائے تو زانی کو جلد یا رجم کی سزا عین حکیمانہ معلوم ہوگی، زنا کے نقصانات کا دائرہ بہت ہی وسیع ہے، یہ نقصانات دینی و اخلاقی، مادی و جسمانی، معاشرتی و روحانی ہر سطح پر مرتب ہوتے ہیں، جس سوسائٹی میں زنا کی کثرت ہوتی ہے وہاں طرح طرح کی بیماریاں پھیلتی ہیں، اس کے افراد کے درمیان دشمنیاں اور جھگڑے جنم لینے لگتے ہیں، اسکی طاقت اور دشمنوں کے دلوں سے اسکا رعب و دبدبہ ختم ہو جاتا ہے [۲۷]، مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ زنا کے نقصانات واثرات کو تحریر کرتے ہوئے لکھتے ہیں، ''زنا خود ایک بڑا سنگین جرم ہونے کے علاوہ اپنے ساتھ سینکڑوں جرائم ونقصانات لیکر آتا ہے، اور اس کے نتائج پوری انسانیت کی تباہی و بربادی، قتل و غارتگری کی صورت میں پیش آتے ہیں، اگر غور سے دیکھا جائے کہ دنیا میں فتنہ وفساد، قتل وغارتگری کے جتنے واقعات پیش آتے ہیں ان سب کا سبب عورت اور اس سے حرام و ناجائز رشتہ ہی ہوا کرتا ہے، کسی شخص کی بیٹی، بہن، بیوی پر ہاتھ ڈالنا خود اسکو قتل کرنا ہے، ایک شریف انسان اپنے سارے مال ودولت کو تو قربان کرسکتا ہے، لیکن اپنی عزت و عصمت پر ہاتھ ڈالے جانے کو برداشت نہیں کرسکتا، اگر کسی کی بیوی، بہن یا بیٹی پر ہاتھ ڈالا جاتا ہے تو وہ اپنی جان کی پرواہ کئے بغیر زانی کو قتل کرڈالتا ہے، اور یہاں سے قتل وقتال کا نہ رکنے والا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، جس سوسائٹی و قوم میں زنا عام ہو جاتا ہے وہاں کسی کا نسب محفوظ نہیں رہتا، جب وہاں سب رشتے پامال ہو جاتے ہیں تو کسی سے بھی نکاح کیا جاسکتا ہے[۲۸]۔

زنا کی وجہ سے تہذیبوں اور نسل انسانی کا صفایا ہو جاتا ہے، پھر ایسے لوگوں کی رغبت حلال تعلق میں ختم ہو جاتی ہے، اس غیر شرعی تعلق کے نتیجہ میں حرامی و ناجائز بچوں کی ایک فوج تیار ہو جاتی ہے، ایسے بچوں کو یا تو پیدا ہونے سے پہلے ہی یا پیدائش کے فوراً بعد ہی قتل کر دیا جاتا ہے، اگر زندہ رہتے ہیں تو ضائع و برباد ہو جاتے ہیں، کیونکہ کوئی بھی انکی تربیت و پرورش کی ذمہ داری نہیں لیتا ہے، نہ انکی تعلیم کا معقول نظم رہتا ہے اور نہ ہی اخلاق کی درستگی کا، پھر یہی بچے بڑے ہوکر مختلف سنگین جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں اور پورے معاشرے کے لئے عذاب بن جاتے ہیں[۲۹]، اس صورت حال کا مشاہدہ مغرب میں آسانی سے کیا جاسکتا ہے، جہاں ہزاروں بچیاں بغیر شادی کے ماں بن جاتی ہیں، اور لاکھوں بچوں کے ماں باپ نہیں، اخلاقی حیثیت سے ایمان وزنا میں کوئی جوڑ نہیں، زنا ایمان کو سلب کرنے والا عمل ہے، اس جرم کے ارتکاب کے وقت انسان ایمان، اور ایمانی احساسات وجذبات سے بھی خالی ہو جاتا ہے[۳۰]، زنا کبائر میں سے ہے، اللہ نے اسکا ذکر شرک وقتل نفس کے ساتھ کیا ہے[۳۱]، ایک جگہ حضور پاک علیہ الصلوۃ والسلام نے خصوصاً نوجوانوں کو اس جرم سے بچنے کی نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ ''زنا میں چھ نقصانات ہیں، تین دنیوی اور تین اخروی، دنیاوی یہ ہیں کہ اس سے چہرے کی دل کشی ختم ہو جاتی ہے، رزق میں کمی ہو جاتی ہے، عمر کو گھٹا دیتا ہے، آخرت میں اسکی وجہ سے انسان غضب الٰہی کا مستحق ہوگا، حساب سخت ہوگا، جہنم کا ایندھن بنے گا[۳۲]، یہ بھی فرمایا کہ ''جب کسی قوم میں زنا کی کثرت ہوتی ہے تو ان پر قحط سالی مسلط کردی جاتی ہے [۳۳]، اور آتشک، سوزاک، کینسر کی بعض قسمیں اور ایڈز[۳۴] جیسی لاعلاج بیماری، اور بھی بے شمار جسمانی بیماریاں اسی جنسی بے راہ روی کا نتیجہ

ہوتی ہیں، درحقیقت زنا کی سزا پورے معاشرے کو ملتی ہے، اور یہ قانونِ فطرت سے بغاوت بھی ہے اور رب کائنات کی عدولِ حکمی اور ناراضگی کا سبب بھی[۳۵]۔

اس لئے اب اگر کوئی زنا کرتا ہے تو اسکو سخت سزا دینا ضروری ہے، اس کے پاس خواہش کو پورا کرنے کا جائز ذریعہ تھا، اس نے اس کو چھوڑ کر حرام طریقہ اختیار کیا، اب اسکو نصیحت کرنا کام نہیں آئیگا، اب یہ زانی اس مریض کی طرح ہے کہ اگر اس سے نہ بچا جائے تو دوسروں کو بھی بیمار بنادے، اب ضرورت ہے کہ اسکی کھال اڈھیڑ دی جائے، اس پر کوڑے برسائے جائیں، یا اسکو سنگسار کر دیا جائے[۳۶]۔

لیکن اسکا مطلب یہ نہیں ہے کہ اب اسلام اس زانی سے ناراض ہے، اسلام طیش وغصہ میں آ گیا ہے، اور بس اسکو فوری سزا کا حکم دیتا ہے، بلکہ سزا کا یہ عمل مختلف قانونی مراحل طے ہونے کے بعد انجام پائیگا، اس سزا کی تنفیذ کے لئے ضروری ہے کہ زانی، زانیہ قاضی کے سامنے آ کر جرم کا اقرار کریں، یا پھر چار عینی گواہ آ کر گواہی دیں، کہ ہم سب نے فلاں جگہ فلاں وقت ان دونوں کو زنا کرتے دیکھا ہے، اور پھر مجرم کا عاقل، بالغ، آزاد، محصن (شادی شدہ ہونا)، اور حنفیہ کے نزدیک مسلمان ہونا بھی ضروری ہے، قاضی دونوں کو رجوع کا موقع دے گا، اگر مذکورہ شرائط میں کچھ بھی کمی ہوئی تو پھر شبہ کی وجہ سے حد جاری نہ ہوگی[۳۷]، سزا جتنی سخت ہے شرائط و قیود بھی اتنی ہی زیادہ سخت ہیں، اس سے اسلام کے اعتدال ونرمی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، یہ شرطیں بہت مشکل سے پوری ہوتی ہیں، خصوصاً چار لوگوں کا بیک وقت زانی کو زنا کی کھلی حالت میں دیکھنا، یہ سب شرطیں اسی وقت پوری ہو سکتی ہیں کہ جب انسان پوری طرح اللہ سے غافل ہو کر شرم وحیا کو تار تار کرتا ہوا علی الاعلان اس کام میں ملوث ہو۔

حدّ زنا کے فوائد و حکمتیں

اب تأدیب کے بجائے سخت سزا ہی اس انسان کا علاج ہے، اب یہ سزا عین حکمت ومصلحت ہے، زنا کی سزا کی وجہ سے ہر انسان کی عزت محفوظ رہے گی، عورتیں بے خوف وخطر اپنی ضروریات کے لئے باہر نکل سکیں گی، اسکی وجہ سے نسب میں کسی طرح کا اختلاط بھی نہ ہوگا، سوسائٹی میں طہارت و پاکی عام ہوگی، جنسی امراض ختم ہو جائیں گے[۳۸]، مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ: اسلام میں تمام ہی سزاؤں کے تین مقاصد ہیں (۱) مجرم وظالم سے اسکے جرم کا بدلہ لیا جائے، کیونکہ اگر حکومت نے اسکو سزا نہیں دی تو لوگ اپنی طرف سے بدلہ لیں گے، اور اس طرح قتل وفساد کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوگا، (۲) اس مجرم کو اِعادۂ جرم سے روکا جائے، کیونکہ اگر جرم کے ثبوت کے بعد بھی مجرم کو سزا نہ دی جائے تو وہ پھر جرم کا ارتکاب کرے گا، (۳) ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اس سزا کو دیکھ کر مجرمانہ میلانات و جذبات رکھنے والے ہیبت زدہ ہو جائیں، اس سزا کو پورے معاشرے کے لئے عبرت خیز بنا دیا جائے، اسی لئے حد زنا کی تنفیذ کے وقت ایک جماعت کے حاضر رہنے کا حکم دیا گیا [۳۹]''و لیشھد عذ ابھما طائفۃ من المومنین [۴۰]: ابن کثیرؒ اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں ھذا فیہ تنکیل للزانین......''(کھلے عام سزا کا حکم اس لئے ہے کیونکہ یہ ہر انسان کو جرم سے باز رکھنے کا سب سے مؤثر طریقہ ہے [۴۱]، اور اگر زانی غیر شادی شدہ ہے تو ۱۰۰ کوڑے لگائے جائیں گے، اور قاضی مناسب خیال کرے تو شہر بدر بھی کر سکتا ہے، حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ اسکی حکمت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: سب سے زیادہ مؤثر سزا وہ ہے جسکا اثر جسم وذہن دونوں پر ظاہر ہو، کوڑوں سے جسم متأثر ہوا، اور شہر بدر کرنے میں وطن عزیز کو چھوڑنے کی وجہ سے ذہنی وقلبی تکلیف ہوگی[۴۲]۔

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ آج بھی جہاں اسلام کا یہ فوجداری نظام قائم ہے، وہاں ایسے وقعات بہت ہی کم پیش

آتے ہیں، سال میں صرف ایک دو لوگوں کو یہ سزا ملتی ہے، اور ہر طرح کا امن وسکون قائم رہتا ہے، اور جہاں اس الٰہی قانون کے مقابلہ وضعی قوانین نافذ ہیں تو انکا کوئی فائدہ نہیں، وہاں روزانہ جنسی جرائم کی شرمناک رپورٹیں اخبارات میں چھپتی رہتی ہیں، غرض کہ اگر غیر جانب دار ہوکر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اسلامی شریعت نے چند آدمیوں کو سزا دیکر خاندان، نسل انسانی، اور پورے معاشرے کی عزت وعصمت کو محفوظ کر دیا ہے، اور مغربی تہذیب نے جنسی آزادی دے کر خاندانی نظام کو منتشر، نسل کو خراب، اور معاشرے کو شر وفساد سے بھر دیا ہے[۴۳]۔

حدّ سرقہ

جہاں تک چوری پر ہاتھ کاٹنے کا مسلہ ہے تو قطعِ ید کی یہ سزا اسلام سے پہلے بھی موجود تھی، اسلام نے آکر اس کو باقی رکھا، اور چوری کی تعریف طے کر کے کچھ قیود وشرائط کا اضافہ کر دیا [۴۴]، دنیا کی دوسری تہذیبوں تمدنوں اور قوانین مین بھی چوری کی سزا کہیں قطعِ ید، کہیں پھانسی، کہیں شہر سے اخراج، کہیں قتل کی شکل میں دی جاتی تھی، اسلام کی آمد کے وقت لوگ اس سزا کی تنفید میں تفریق کرتے تھے، شرفاء کو چھوڑ دیا جاتا اور کمزوروں کے ہاتھ کاٹ دیئے جاتے تھے[۴۵]، اسلام نے تمام خامیوں کو دور کیا اور سب سے پہلے چوری کی تعریف متعین کی،: چوری یہ ہے کہ کوئی انسان دوسرے کا مال کسی محفوظ جگہ سے اسکی اجازت کے بغیر لے لے[۴۶]، اسلئے اگر اب کوئی پبلک مقامات، ریل، ہوائی جہاز، عیدگاہ، پارک، کلب، اسٹیشن سے کوئی چیز چرالے، اسی طرح اگر پیڑ پر لگے ہوئے پھلوں، یا شہد کی چوری کرلے تو قطعِ ید کی سزا جاری نہ ہوگی، کیونکہ یہ جگہیں محفوظ نہیں ہیں[۴۷]، اسی طرح اگر ایسے مال کی چوری کی جس میں اس کا بھی حق ہے جیسے:- غنیمت، میراث، مشترکہ تجارت کا مال، اسی طرح اگر جیب کاٹی، مال غصب کر لیا تب بھی حد سرقہ جاری نہیں ہوگی کیونکہ چوری کی تعریف مکمل نہیں ہے[۴۸]، دو مردوں کی گواہی بھی ضروری ہے، عورتوں کی گواہی معتبر نہیں، چور کا عاقل وبالغ ہونا، مال مسروق کا بقدرِ نصاب ہونا ضروری ہے[۴۹]، اسلام کے اس عادلانہ قانون کو بیمار ذہنیت کے لوگ نشانہ بناتے ہیں، انکے خیال میں اس سزا سے آدھا معاشرہ ناکارہ ہو جائیگا، اصلاً ان لوگوں نے کبھی چوری کے نقصانات واثرات پر غور نہیں کیا۔

جب ایک چور کسی کی محنت سے جمع کئے ہوئے مال کو لے کر چلتا بنتا ہے تو وہ دوسرے انسان کو مایوسی، فقر واحتیاج کی حالت میں پہونچا دیتا ہے، اب یہ انسان اپنے اہل وعیال کے خرچ کے لئے قرض لینے پر مجبور ہوگا، ایک چور پوری طاقت سے اپنے عمل کو انجام دیتا ہے، دیواروں کو پھلانگتا دکانوں میں سیدھ لگاتا، گھروں میں نقب لگاتا ہے، ہر دفاع کرنے والے انسان کو بے دھڑک قتل کر ڈالتا ہے، اس طرح چور خوف ودہشت، اضطرب وبے چینی کو عام کر کے سکون واطمینان کے اس کامل ترین نظام کو ختم کر دیتا ہے، جو اسلام نے فرد وجماعت کے لئے بنایا تھا، ایک طرح سے یہ جرم قتل انسانی سے بھی بڑھا ہوا ہے، قتل کا اثر مقتول کے ورثاء تک محدود رہتا ہے لیکن چوری کے اثرات اجتماعی، سیاسی، تجارتی زندگی تک پہونچتے ہیں[۵۰]، اس جرم کی سنگینی اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اللہ نے تو اس چور کو حلال کمانے اور حرام سے بچنے کا حکم دیا تھا اسکی اصلاح وتربیت کا انتظام کیا تھا، ضرورت مندوں کی ضروریات کی تکمیل کے لئے زکوٰۃ وصدقات کی تقسیم کا حکم دیا، حاکم کو حکم دیا کہ وہ ہر محکوم کے مکان کا انتظام کرے، لیکن پھر بھی یہ چوری کیوں کرتا اور غیروں کے مال پر نظر کیوں رکھتا ہے؟ اتنی آسانیوں کے بعد بھی بغیر کسی معقول عذر کے اس نے چوری کیوں کی؟ اب یہ دولتمند بننے کی ہوس میں چوری کرتا اور اسی معاشرے کو نقصان پہونچانا چاہتا ہے جسکے ساتھ رہتا ہے[۵۱]، اب یہ غیر معمولی سزا کا مستحق

ہے، اگر قطعِ ید کے علاوہ کوئی دوسری سزا مثلاً قید و بند یا پٹائی کی سزا ہو تو یہ جرم ختم نہ ہوگا، اس جرم کے استیصال کے لئے قطع ید کی سزا ہی مناسب ہے، کیوں کہ یہ سزا چور کی کار کردگی میں حائل ہوتی ہے، اب اس کے جرم کا نتیجہ اسکے ہاتھ پر ثبت ہے، یہ سزا اسکے گزشتہ جرائم کا اعلان کر رہی ہے، اب یہ سزا دوسروں کے لئے تنبیہ و تنذیر کا سبب اور عبرت کا سامان بن جائیگی، آج بھی جہاں یہ سزا نافذ ہے وہاں مال و دولت کے سلسلے میں مکمل اطمینان و بے فکری پائی جاتی ہے، دکاندار کروڑوں کا مال کھلی دکانوں میں چھوڑ کر نمازوں کے لئے چلے جاتے ہیں، اور جہاں اس الٰہی سزا کے بجائے کوئی دوسری سزا نافذ ہے وہاں ہر طرح کی نگرانی و سیکورٹی کے باوجود ہر جگہ، ہر وقت چوری و ڈکیتی کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں[۵۲]۔

حدّ خمر

تمام آسمانی ادیان و مذاہب کی طرح اسلام بھی شراب نوشی کو حرام قرار دیتا ہے، شراب عربوں کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی، اسلئے اسکی حرمت تدریجاً نازل ہوئی، پہلے یہ کہا گیا کہ اس میں نفع کم اور نقصانات زیادہ ہیں[۵۳]، پھر نشے کی حالت میں نماز سے دور رہنے کو کہا گیا[۵۴]، عقلمندوں کے لئے یہی اشارہ کافی تھا، پھر بعد میں سورۃ المائدہ میں شراب کا قطعی حکم نازل ہوا[۵۵]، شرب خمر کی سزا حضور پاکؐ کے دور میں یہ تھی کہ شرابی کو لکڑی، کھجور کی شاخوں، جوتے و چپل اور گھونسوں سے مارا جاتا تھا، حضرت عمرؓ نے اپنے دور میں اسکی سزا صحابہ کے مشورے سے ۸۰ کوڑے مقرر فرمائی[۵۶]، اگر شراب نوشی کے دینی و اخلاقی، ذھنی و جسمانی، اجتماعی و معاشرتی نقصانات کو دیکھا جائے تو یہ سزا بالکل درست اور عین حکیمانہ نظر آتی ہے، حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ آیت کریمہ " یـأیهـا الـذین آمنوا انما الخمر ..... الخ " کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ شراب پینے میں دو طرح کے نقصانات ہیں، ایک انفرادی، دوسرا اجتماعی، اجتماعی یہ ہے کہ شرابی نشے میں بدمست ہو کر قتل و غارت گری شروع کر دیتا ہے، انفرادی نقصان یہ ہے کہ شراب کی وجہ سے آدمی کچھ دیر کے لئے اس جوہر عقل و فکر سے محروم ہو جاتا ہے جو اللہ کی معرفت کا خاص ذریعہ ہے[۵۷]، شرابی اپنے ہم جنسوں پر ظلم و تعدی کرتا ہے، خود اسکے قلب و جگر اور سانس کے نظام کو اتنا نقصان ہوتا ہے کہ اسکے پھیپھڑے کام کا کرنا بند کر دیتے ہیں، قوت حافظہ میں کمی اور غصے میں اضافہ ہو جاتا ہے، شرابی اپنے گھر کے سارے اثاثہ کو اسی میں اڑا دیتا ہے جسکی وجہ سے اسکا خاندان معاشی طور پر بدحال ہو جاتا ہے [۵۸]، غرض کہ شراب سے سیکڑوں برائیاں پیدا ہوتی ہیں، آج اس دنیا کے اندر کتنے قتل، کتنی خود کشیاں، عزت و عصمت کے ساتھ کھلواڑ کے کتنے واقعات، ریل، موٹروں کے تصادم، ملک و قوم کے راز دشمنوں کے ہاتھ بیچنے کے واقعات شراب نوشی کی وجہ سے پیش آتے رہتے ہیں، حضور پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا احسان جتلانے والا، رشتوں کو توڑنے والا، اور شراب کا رسیا کبھی جنت میں نہ جائیں گے [۵۹]، ایک جگہ فرمایا: جو شراب نوشی کی عادت کے ساتھ مرے گا اسکو جنت کی خوشبو بھی حاصل نہ ہوگی[۶۰]، انہی نقصانات کی وجہ سے شراب کے بنانے، پینے اور اسکی خرید و فروخت کو حرام قرار دیا گیا اور مے خواری کی سزا ۸۰ کوڑے مقرر کی گئی، یہی سزا انسان کو اس جرم سے روک سکتی اور اس کا خاتمہ کر سکتی ہے، کیونکہ جو لوگ شراب پیتے ہیں وہ کسی وعظ و نصیحت سے باز نہیں آتے، انکے ساتھ نرمی فضول ہے، آج دنیا کے اندر بے شمار مفکرین، دانش وران، ڈاکٹرز، تہذیب و تمدن کے بڑے بڑے مراکز میں رہنے والے ایسے لوگ ہیں جو شراب کے نقصانات پر بولتے اور لکھتے ہیں، لیکن خود اس لت میں پڑے ہوئے ہیں، دنیا کا ہر بناوٹی قانون یہاں ناکام ہے

[۶۱]، وجہ یہ ہے کہ انکے دلوں میں کسی چیز کا خوف نہیں ہے، بس ایک الٰہی ربانی قانون ہی ایسا قانون ہے جو اس جرم کو ختم کرسکتا ہے[۶۲]۔

حدّ قذف

ایک اور جرم جسکی سزا قرآن میں بیان کی گئی ہے وہ کسی پاک دامن مرد وعورت پر زنا کی تہمت لگانا ہے، اسکی سزا ۸۰ کوڑے ہے [۶۳]، یہ سزا بھی جرم کے مطابق ہے، ہر انسان یہ چاہتا ہے کہ سوسائٹی میں عزت و وقار کی زندگی گزارے، اسے کسی طرح ذلیل ورسوا اور بدنام نہ کیا جائے اسلئے اسلام میں انسان کی عزت وآبرو کو بڑا مقام حاصل ہے، اسلام فواحش کے ارتکاب، گندی باتوں کے پھیلنے اور کسی کی عزت وآبرو سے کھلواڑ کو سخت ناپسند کرتا ہے، اسی لئے عزت وآبرو کے سلسلے میں سب سے زیادہ اہمیت زنا وبد کاری کے الزام کو دی ہے، کیونکہ یہ معاملہ بڑا نازک ہے اسلئے چار گواہوں کی شہادت ضروری قرار دی گئی، اگر گواہ نہ ہوں تو قاذف پر ۸۰ کوڑوں کی حد جاری ہوگی، حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ اس نے الزام لگا کر اللہ کی بھی نافرمانی کی اور مسلمان بھائی کو سخت تکلیف پہونچائی اسلئے یہ سزا ضروری ہے [۶۴]، اگر یہ سزا نہ ہوتو بے شمار مسائل پیدا ہونگے، بدزبانوں کو کھلی چھوٹ حاصل ہوجائیگی، بغیر دلیل کے بکواس کرنے والوں کو کچھ بھی بکنے کا موقع مل جائیگا، ہر انسان صبح وشام بدنام ہوگا، تہمت سے کوئی بھی محفوظ نہ رہ سکے گا، میاں بیوی، بھائی بہن سب ایک دوسرے پر شک کرینگے، اس طرح آزادی دینے سے معاشرے میں غیر محسوس طریقے پر زنا کارانہ ماحول پھیلتا چلا جائیگا، شہوانی جذبات کی ایک عام روچل پڑے گی، گندے مرد وعورتوں کو یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ معاشرے میں کہاں کہاں انکے لئے مواقع ہیں، اور قاذف نے تہمت لگا کر اپنے بھائی کی بے عزتی کی، لوگوں کو اسکے بارے میں بڑھ چڑھ کر باتیں بنانے کا موقع فراہم کیا، ایسے تہمت کی وجہ سے پورے معاشرے میں بغض وعداوت، تعلقات کی خرابی عام ہوجاتی ہے، اسلئے اگر کوئی کسی پر تہمت لگائے اور الزام کو ثابت نہ کرسکے تو اس پر حد قذف جاری ہوگی، اسکو ہمیشہ کے لئے فاسق اور مردود الشھادۃ قرار دیا جائیگا[۶۵]، اس سزا کا یہ فائدہ ہوگا کہ اس سے آشنائیوں اور ناجائز تعلقات کے چرچے بالکل بند ہوجائنگے، معاشرہ اس سزا کو دیکھ کر سہم جائیگا، عزتیں محفوظ ہوجائنگی[۶۶]۔

غرض کہ اسلامی شریعت کسی کی عزت وآبرو کی حفاظت کو بھی وہی اہمیت دیتی ہے جو اہمیت اسکی جان ومال کو دیتی ہے، اور اس سزا کا کھلا فائدہ ہر انسان محسوس کرسکتا ہے[۶۷]۔

حواشی و حوالہ جات

[۱] روزنامہ عزیز الہند ۱۱ مئی ۲۰۱۴ء وروزنامہ انقلاب ۲۸ مئی ۲۰۱۴ء، [۲] الفقه على المذاهب الاربعة ج ۵/ ۳۹۴، عبد الرحمٰن الجزیری (بیروت ، لبنان)، [۳] فتح الباری ج ۱۵/ ۴۸۱-۴۸۶، الطبعة الاولیٰ ، دار أبی حیان، القاهرہ، ۱۹۹۶ء، [۴] قانون قصاص کی حکمتوں وفوائد کو سمجھنے کے لئے فتح الباری ج ۱۵/ ۵۱۷-۵۲۷، کو دیکھ لیا جائے، [۵] الفقه على المذاهب الاربعة ج ۵/ ۱۴۔ [۶] البقرہ (۱۷۹)۔ [۷] المائدہ (۴۵)۔ [۸] فتح الباری ج ۱۵/ ۳۰۳ (القاہرہ)۔ [۹] الفقه على المذاهب الاربعة ج ۵/ ۱۲ (بیروت، لبنان)۔ [۱۰] فتح الباری ج ۱۵/ ۳۰۳ (القاہرہ)۔ [۱۱] معارف القرآن شفیعی ، ج ۶/ ۳۶۱ فرید بکڈپو ۱۹۹۸ء اسکے لئے یومیہ اخبارات کو دیکھنا کافی ہے۔ [۱۲] فتح الباری ج ۱۵/ ۳۰۳ (القاہرہ)۔ [۱۳] الفقه على المذاهب الاربعة ج ۵/ ۱۲ (بیروت، لبنان)۔ [۱۴] سورۃ المائدہ آیت ۳۸ میں مطلقاً قطع ید کا حکم ہے، باقی تفصیل احادیث سے

ثابت ہے۔[۱۵]النور (۴)۔[۱۶]شرح مسلم للنووی ، ج ۲/ ۷۱-۷۲۔[۱۷]تفہیم القرآن، ج ۳/ ۳۱۹-۳۴۷۔[۱۸]سورۃ الاسراء (۳۲)۔[۱۹]سیرۃ النبی، علامہ سید سلیمان ندویؒ، ج ۶/ ۲۶۰، شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ ۲۰۱۱ء۔[۲۰]النور، ۳۰-۳۱۔[۲۱]الأحزاب، ۵۹۔ [۲۲]مسند احمد ، (۱۸۸۷۹ - ۱۸۰۱۲)۔ [۲۳]اسلامی فقہ، مولانا مجیب اللہ ندوی مرحوم ج ۳/ ۲۷-۲۸، طبع ثانی ۲۰۰۲ء، تاج کمپنی دھلی۔[۲۴]مشکوۃ شریف، کتاب النکاح۔[۲۵]ایضاً۔[۲۶]اب تو ۳/ ۴ سالہ بچیوں کو قتل کر کے انکے ساتھ ہوس پوری کرنے کے واقعات بھی عام ہو چکے ہیں،۔[۲۷]الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ج ۵/ ۵۵ (بیروت، لبنان)۔ [۲۸]معارف القرآن، مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندیؒ ج ۶/ ۳۴۲، فرید بکڈ پو دھلی۔[۲۹]الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ج ۵/ ۵۵-۶۴۔[۳۰]البخاری (۲۴۷۵) ابوداؤود (۴۷۸۹) ترمذی (۲۶۲۵)۔ [۳۱]الفرقان (۶۸)[۳۲] التفسیر المنیر ج ۹/ ۴۶۰، دکتور وھبہ زحیلی، الطبعۃ العاشرۃ (دار الفکر دمشق)۲۰۰۹ء۔[۳۳]مشکوۃ، کتاب الحدود۔[۳۴]یمنی مجاہد عالم دین شیخ عبد المجید زندانی نے ایڈز کی بعض دوائیں تیار کی ہے،۔[۳۵]حلال وحرام، خالد سیف اللہ رحمانی ص ۲۹۴-۲۹۵۔[۳۶] تفہیم القرآن ج ۳/ ۳۱۱-۳۴۷۔[۳۷]اسکی تفصیل فتاوی کی کسی بھی اہم کتاب میں دیکھی جاسکتی ہے۔[۳۸]التفسیر المنیر ج ۹/ ۴۶۰۔[۳۹]تفہیم القرآن، تفسیر سورۂ نور۔[۴۰]النور (۲)۔[۴۱]تفسیر ابن کثیر، ج ۴/ ۵۰۴۔[۴۲]حجۃ اللہ البالغۃ، مبحث فی الحدود ج ۲/ ۱۶۰، ۱۷ سال تک یہ نافذ رہا لیکن اسی مدت میں سب سے زیادہ شراب استعمال کی گئی۔ [۴۳]اسلامی فقہ ج ۳/ ۲۶، مجبوراً حکومت کو یہ قانون ختم کرنا پڑا، اسکے لئے مولانا مودودیؒ کی کتاب ''تنقیحات''۔[۴۴]تفسیر ابن کثیر، ج ۳/ ۲۶۔[۴۵] مسلم کتاب الحدود باب حد السرقہ، وتفسیر ماجدی ج ۲/ ۷۳، مجلس تحقیقات ونشریات لکھنؤ۔[۴۶]حجۃ اللہ البالغۃ، ج ۲/ ۱۶۲-۱۶۳۔[۴۷]معارف القرآن، ج ۳/ ۱۳۰ فرید بکڈ پو دھلی۔[۴۸] حجۃ اللہ البالغۃ، ج ۲/ ۱۶۲۔[۴۹]حنفیہ کے نزدیک مسروقہ مال کا دس درہم کی قیمت کے بقدر ہونا ضروری ہے۔[۵۰]التفسیر المنیر ج ۳/ ۵۳۳، (دار الفکر دمشق)۔[۵۱]فی ظلال القرآن ج ۴/ ۱۸۱ -۱۹۰۔[۵۲]تفسیر السعدی ج ۱/ ۶۸۴۔[۵۳] البقرۃ (۲۱۹) اس سلسلے میں یوٹیوب پر انکے بیانات موجود ہیں۔[۵۴]النساء (۴۳)۔[۵۵]المائدۃ (۹۰ - ۹۱)۔ [۵۶]مؤطاء مالک (۵۴۱)۔ [۵۷]حجۃ اللہ البالغۃ، ج ۲/ ۱۶۲-۱۶۳۔ [۵۸]البعث الاسلامی رجب ۱۴۳۵ھ کے شمارہ میں دکتور ابن زریطہ حمیدہ کا مضمون۔ [۵۹] ابن حبّان (۴۸۳)۔[۶۰]ابوداؤود (۳۶۷۹) ترمذی (۱۸۶۱) مؤطا (۱۵۵۰)۔ [۶۱]امریکی حکومت نے شراب کے استعمال کو روکنے کے لئے ''قانون تحریم خمر'' نافذ کیا، میں مضمون بعنوان '' الٰہی قانون اور انسانی قانون'' کا مطالعہ کیا جائے۔[۶۲]الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ج ۵/ ۱۵ (بیروت، لبنان)۔[۶۳]النور (۴)۔[۶۴]حجۃ اللہ البالغہ ج ۲/ ۱۵۸۔ [۶۵]یہ قرآن کا حکم ہے، النور، (۴)۔[۶۶]تفہیم القرآن ج ۳/ ۳۱۹-۳۴۷۔[۶۷]اسلامی فقہ ج ۳ /۶۳، (تاج کمپنی دھلی)

☆☆☆

فکر اسلامی

(قسط-۱)

مفکر اسلام- ایک مطالعہ

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

نوٹ: یہ تحریر در حقیقت راقم کی تیار کردہ کتاب ”مفکر اسلام ایک مطالعہ“ کا پیش لفظ ہے، اس کتاب میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی متعدد کتابوں بالخصوص ان کی خود نوشت سوانح ”کاروان زندگی“ سے اقتباسات لے کر عصری تقاضوں کے پیش نظر فکر اور لائحہ عمل دینے کی کوشش کی گئی ہے، اس سے جہاں حضرت مولاناؒ کے افکار کا مکمل نہیں تو سر سری مطالعہ ضرور ہوجاتا ہے وہیں ساتھ ہی علماء اور خدام دین وملت کو عملی میدان کے لیے خلوص وہمت کے ساتھ لائحہ عمل بھی ملتا ہے، اب یہ کتاب افادۂ عام کی غرض سے قسط وار شائع کی جارہی ہے۔ (مدیر)

مجھے یہ ڈر ہے دل زندہ تو نہ مر جائے
کہ زندگی ہی عبارت ہے تیرے جینے سے

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی جس وقت اس دار فانی سے رحلت ہوئی تو یہ ایک عام تأثر پایا گیا کہ ملت اسلامیہ ایک عظیم، جرأت مند وبے باک اور دینی غیرت وایمانی حمیت سے سرشار ومخلص اور حق گو داعی سے محروم ہوگئی ہے، اور بالخصوص ہندوستان کی ملت اسلامیہ یتیم ہوکر رہ گئی ہے، میری ناقص نظر میں مولانا اس سلسلہ میں یکتا تھے کہ ایک طرف اخلاص کی دولت سے مالا مال، ملی تڑپ ان کے سینہ میں موجزن، علم ومطالعہ سے ان کی زندگی عبارت، سلوک وتزکیہ میں کندن بنی شخصیت، وسیع نظر اور بیش قیمت تجربات کا سرمایہ ان کے پاس تھا، دینی غیرت اور ایمانی حمیت آپ کا سرمایۂ افتخار تھی، خم ٹھونک کر حق کا اظہار آپ کا طرۂ امتیاز تھا، مولانا کی پوری زندگی کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مولاناؒ نے ہمیشہ مذہبی مفاد، دین کی بالا دستی، ملی مفاد اور حق گوئی کو اپنا شعار بنایا اور کبھی بھی اس میں کسی فرد وادارے یا شہرت وجاہ طلبی اور ادنی درجہ کی مادیت پسندی یا اور کوئی مصلحت حائل نہ ہوئی، درحقیقت مولانا کے اخلاص واستغناء میں ہی ان کی جرأت وحق گوئی کا راز مضمر ہے۔

جامعیت کے ساتھ خانقاہ و مدرسہ، ملی مسائل وعصری جامعات اور علمی وتصنیفی میدان کو اپنی دعوتی سرگرمیوں کی جو لانگاہ بنایا، وفات کے بعد جوں جوں وقت گزرتا گیا مذکورہ بالا شعر (جو خود مولاناؒ نے ایک جگہ ذکر کیا ہے) اپنی معنویت کا احساس دلانے لگا، کہ وہ بے لوثی، وہ اضطراب وتڑپ، وہ اخلاص اور فکر وعمل جس سے مولانا کی زندگی عبارت تھی، ان کی زندگی اسی زندہ دلی کا سحر انگیز نتیجہ تھی، اب وہ زندہ دلی ہی نہیں نظر آتی تو مولاناؒ جیسا بلند کردار، ان کے جیسی جرأت گفتار، ملی مسائل پر تڑپ جانے اور تڑپا دینے کا وصف اور وسیع القلبی و وسیع النظری کہاں نظر آئے۔

اب تک مفکر اسلامؒ کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور مختلف زبانوں میں لکھا گیا ہے، ان کے منہج تنقید پر اور ان کے ادبی نظریہ پر عربی میں ایم، فل وپی، ایچ، ڈی کے مقالے لکھے گئے، عبدالقادر چوغلے (ساؤتھ افریقہ) کی دو ضخیم کتابیں انگریزی میں شائع ہوچکی ہیں، اس لئے اس کتاب میں قطعی نہ

ہی مولانا کی مکمل سوانح پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور نہ ہی آپ کی جملہ علمی فتوحات اور کارہائے نمایاں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اس کتاب میں ایک خاص داعیہ کی بنیاد پر چند کتابوں سے مولاناؒ کی تڑپ، بے پناہ اخلاص، بے لوثی، عملی پیش رفت، دینی حمیت وغیرت ایمانی کے واقعات اور جرأت مندانہ اقدامات اور منہج نقد و اصلاح کو پیش کرنے کے لئے اقتباسات پیش کیے گئے ہیں، جس میں صاف طور پر مولانا کی شخصیت ایک حق گو مومن ومفکر کے طور پر نظر آئے گی، بالخصوص مولانا کی خودنوشت سوانح ''کاروان زندگی'' سے اقتباسات پیش کیے گئے ہیں، کیونکہ اس میں مولانا کی زندگی کا خلاصہ اور ان کی مبارک مساعی کا عطر موجود ہے، مولانا نے خود اپنی ترجمانی کی ہے اس لئے وہ بنیادی مصدر ہے، ہر اہم سفر، کتاب وخطاب کا اسمیں خلاصہ ہے، آپ کی سیکڑوں کتابوں کے بجائے اس دور میں صرف ''کاروان زندگی'' کی ضخیم جلدوں کا مطالعہ بھی مشکل ہوتا ہے، اور پھر مولانا کے فکر کو سمجھنے کے لئے آپ کی عربی تحریروں تک رسائی ضروری ہے، کیونکہ آپ کی علمی جولانیوں اور دعوتی سرگرمیوں کا اصل میدان عرب اور حقیقی وسیلہ عربی ہے، اس دور میں جبکہ زندہ دلی مفقود ہوئی جاتی ہے، ہر تحریک اور عمل کسی مفاد سے وابستہ ہوا جاتا ہے، اخلاص و بے لوثی ناپید ہوئی جاتی ہے، جاہ ومنصب کی طلب اور مادیت پسندی سے کوئی خالی نظر نہیں آتا، حق گوئی و بیباکی اور جرأت مندانہ تنقید برائے اصلاح سے بھی اعراض کیا جاتا ہے، اس صورت حال میں کوشش کی گئی کہ حضرت مولاناؒ کی زندگی کے ان تابناک پہلوؤں کو ''کاروان زندگی'' کی روشنی میں پیش کیا جائے، ''کاروان زندگی'' میں اجمالی طور پر مصنفؒ کے تمام افکار وخیالات اور احساسات کا اجمالی طور پر در آنا ایک فطری بات ہے، حیرت کی انتہائی نہ رہی جب دوران مطالعہ خود حضرت مولانا کے قلم سے یہی بات لکھی دیکھی:

''اس تصنیف کا محرک یہ خیال تھا کہ اپنے فکری شعور، ذہنی ارتقاء، تحریر وتصنیف کی تاریخ، اور اپنے زمانہ کے اہم واقعات وحوادث اور دعوتوں اور تحریکوں کا ذکر کرنے کے سلسلہ میں اپنے ان خیالات وافکار، مشاہدات وتاثرات اور دعوت وتحریک کو (اجمالاً و اختصاراً سہی) اور اپنی تحریروں اور کتابوں کے مرکزی نقطۂ خیال اور ان کے اہم اقتباسات کو پیش کرنے کا موقعہ ملے گا، جو کثیر التعداد مضامین اور ان کتابوں میں بکھرے ہوئے ہیں (جن کی تعداد اب دوسو سے اوپر ہو چکی ہے) اور جن پر بیک وقت ہر صاحب ذوق کی نظر پڑنی مشکل ہے۔ (کاروان زندگی ج۶ ص۱۰)

میں نے چند کتابوں اور بالخصوص ''کاروان زندگی'' کو سامنے رکھ کر محض مولانا کے مجاہدانہ کردار، جرأت گفتار، صریح تنقیدیں، واضح مشورے، اصلاح وتغیر کے عمل میں حرکت و پیش قدمی، ملی تڑپ، مسائل کے حل کی تلاش میں تگ و دو، اخلاص و بے لوثی، لوگوں کو برتنے کا انداز، تمام تر مفادات سے بالا ہو کر اپنی ساری زندگی کو اسلام کی خدمت میں لگا دینے اور کسی پل بھی خالی اور چین سے نہ بیٹھنے کی ایک مؤثر ومتحرک اور دلکش ودلآویز تصویر دکھانے کی کوشش کی ہے، میری نظر میں اس کوشش سے ایک طرف تو مولانا کے افکار وانداز کی اشاعت وو ضاحت ہوگی تو دوسری طرف اس عہد میں مولانا کے افکار، ان کی کوششوں اور طریقۂ عمل کی معنویت وضرورت اور اہمیت بھی اجاگر ہوگی اور اس کا اندازہ ہو سکے گا کہ ان حالات میں اس تڑپ، حرکیت و جامعیت اور بے لوث خدمت کی کس قدر ضرورت ہے، ورنہ اگر مولاناؒ کی خدمات اور علمی وعملی زندگی کا مکمل جائزہ پیش کرنا مقصد ہوتا تو محض کوئی ایک ہی پہلو ضخیم کتاب کا متقاضی ہے، اس کا یہ موقع بھی نہیں اور اس کی ضرورت بھی نہیں، کیونکہ مولاناؒ کی خدمات وحیات پر متعدد کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں، عالم اسلام کی ایک مؤثر شخصیت مجاہد وقت وچراغ سحر ڈاکٹر یوسف القرضاوی حفظہ اللہ نے انتہائی محبت و احترام میں اپنے قلم کو دھل کر اپنی تصنیف ''ابو الحسن الندوی کما عرفته'' پیش کی، ڈاکٹر عبداللہ عباس ندویؒ نے سب سے پہلے ایک جامع کتاب ''میر کارواں'' پیش کی، جو ان کے قلم کی روانی، اسلوب کی شگفتگی اور

حقائق نویسی میں ممتاز ہونے کے ساتھ سوانحی ادب میں گراں قدر اضافہ ہے، مولاناؒ کے جانشین، سفر وحضر کے رفیق اور طویل رفاقتوں میں قریب سے دیکھنے والے متاع عہد آخر مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صاحب نے بھی ''مولانا علی میاں عہد ساز شخصیت'' کے نام سے مولانا کی حیات پر مفصل کتاب پیش کی، اس کے علاوہ عربی میں نوجوان فاضل سید عبدالماجد غوری نے بھی ضخیم ومعلوماتی کتاب تیار کی، پروفیسر محمد اجتباء ندویؒ، پروفیسر محسن عثمانی ندوی، مولانا سید محمد واضح رشید ندوی کی کتابیں بھی لائق استفادہ ہیں، مولانا کے فکری پہلوؤں پر متعدد مقالات اور کتابوں میں ترکی عبد مجید السلمانی کی کتاب ''الفکر والسلوك السیاسی عندابی الحسن الندوی'' اوراحمد الوثمی کی ''منهج النقد عند أبی الحسن'' لائق مطالعہ ہیں، مولانا کے افکار و دعوت کو سمجھنے کے لئے ان کے ہی فرد خاندان مولانا بلال عبدالحی حسنی صاحب کی کتاب ''حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی دعوت وفکر کے اہم پہلو'' کافی ضخیم ومفصل ہونے کے ساتھ بہت مفید ہے، کیا ہی خوب ہو کہ اسکو عربی میں منتقل کر کے عالم عربی میں عام کیا جائے، یہ کتاب ۶ ابواب پر مشتمل ہے، مولانا کے تقریبا تمام افکار اور خدمات کا احاطہ کرتی ہے،

واقعہ یہ ہے کہ مولاناؒ جس جامعیت کے حامل وداعی تھے اس کو کسی ایک کتاب میں جمع کرنا بہر حال مشکل ہے، اور جب اس مشکل کو ممکن بنایا جاتا ہے تو کتاب ضخامت کے سبب عام قارئین کی دسترس سے باہر ہو جاتی ہے، یہی بنیادی سبب ہے کہ اس وقت جس چیز کا سب سے زیادہ تقاضہ تھا اس کو الگ سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی۔

مولاناؒ جس جامعیت کے حامل تھے اس کے سبب ان کے تصنیفی شوق کو کبھی بھی دعوت وتبلیغ کے فریضہ نے رکنے نہ دیا اور نہ ہی اس کے برعکس ہوا کہ ان کی دعوتی زندگی علمی فرائض کی ادائیگی سے متاثر ہوئی ہو، تقریری وتحریری عمل ایک ساتھ جاری تھا، علمی انہماک اور دعوتی سرگرمیوں کے ساتھ اجتماعی مسائل سے کبھی بچنے کی کوشش نہیں کی، گوشۂ عافیت کو ملی مسائل پر کبھی حاوی نہ ہونے دیا، ضرورت وبساط بھر ملک وملت کے لئے سیاسی کوششیں بھی کیں، کہ مولانا ہی کے الفاظ میں ''تعمیری سیاست کے ذریعہ ملت کے تحفظ میں حصہ لینا ضروری ہوتا ہے'' مولانا کی یہی جامعیت تھی جسنے انکو ہر دلعزیز ومثالی کردار کی حامل شخصیت بنادیا۔

حضرت مولاناؒ ابتدا میں جماعت اسلامی سے متعلق ہوئے، پھر تبلیغی جماعت سے تعلق ہوا بلکہ اس فکر ودعوت کو دنیا بھر میں عام کرنے میں آپ کا بڑا حصہ رہا، آخر تک مولانا نے اس سے اپنا تعلق باقی رکھا، جماعت اسلامی سے علیحدگی اور مولانا مودودیؒ سے بعض اختلافات کے باوجود کبھی کوئی ایسی بات زبان پر نہ آئی جو فکری اختلاف سے آگے بڑھ سکے، مولانا نے ان دونوں طریقہائے دعوت کے درمیان سے ایک اور راستہ اختیار کیا اور سب کو ساتھ لے کر اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے ساری زندگی مصروف عمل رہے، آپ نے امراء وملوک، علماء ودانشوران اور عوام الناس کے ہر حلقہ میں اپنی دعوت پہنچانے کی کوشش کی اور ہر طبقہ کو اپنا مخاطب سمجھا اور کسی حد تک متاثر بھی کیا، ابتداء سے ہی مولانا نے انقلابی طبیعت پائی تھی جس کا اظہار آخر تک حرکیت کی شکل میں بار بار ہوتا رہا اور جس کی جھلک ''کاروان زندگی'' کی آخری جلد میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔

مولانا کی زندگی سے یہ سبق ملتا ہے کام کرنے کی کوئی عمر نہیں ہوتی، بس اس کے لیے کردار، تڑپ اور اخلاص درکار ہے، آزادی کے بعد متصلاً جب کبار علماء ملک میں موجود تھے، اور مولانا نوجوان تھے تب بھی مولانا کو ملک کی صورت حال نے بے چین کیا تو ''نشان راہ'' کے عنوان سے ایک مضمون تیار کیا اور ندوۃ العلماء میں ایک اجتماع بلایا اور مستقبل میں ملت اسلامیہ کے مسائل پر گفتگو کی، جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ کسی بات کو کہنے کے لئے وہ مقام، وہ عمر ومرتبہ چاہیے جہاں سے کوئی تبصرہ کیا جاسکے اور کوئی بڑی اور حق بات کی جاسکے، کسی حد تک بجا اور بالکل بجا! لیکن جب مصلحت پسندی اور سچ یہ ہے کہ سکوتِ بے جا اور اپنے آپ میں گم رہنے کی روش عام

ہوجائے تو پھر کیا کیا جائے، کوئی تو ہو جو حق گوئی کرے اور حق کا غلغلہ ہر جگہ بلند کرے، مولانا نے بے شمار ایسے نقوش چھوڑے ہیں کہ اخلاص وانابت اور جرأت مومنانہ کے ساتھ اصلاح وحق گوئی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے، ہمیشہ حکمت کے ساتھ مدلل انداز میں حق بات کہی جائے، ابتدائی عملی زندگی میں تو یہ نقوش ملتے ہی ہیں، آخری عمر میں امراض وضعف بھی ملی مسائل میں اس حق گوئی اور مواقع تلاش کر اپنی بات کہنے کے عمل سے نہ روک سکے، علم وادب کی وادیوں کو سیراب کرنے کے ساتھ خانقاہ کو آباد کرنا اور اجتماعی وملی مسائل میں دلچسپی لینا ہی مولاناؒ کا وصف امتیازی ہے۔

وہ ہمیشہ دعوت واصلاح کے مواقع ڈھونڈا کرتے تھے، بسا اوقات تو طبیعت کے آمادہ نہ ہونے کے باوجود مختلف مجالس اور کانفرنسوں میں صرف اس جذبہ سے مجبور ہوکر شرکت کرتے تھے کہ حکومت کے نمائندوں اور امت کے منتخب مجمع کے سامنے ایمانی دعوت پیش کرنے اور اصل حقائق کو واشگاف کرنے کا یہ موقع کہیں ہاتھ سے نہ چلا جائے، اندرون کتاب پیش کئے گئے اقتباسات میں اس کی دلیل ملے گی، مولانا کے یہاں حکمت اور تنقیدی بصیرت کے ساتھ اپنی پوری بات پیش کرنے کی بے شمار مثالیں ہیں، مولانا اکثر جب کسی پر تنقید کرتے، اس کے کمزور پہلوؤں پر انگلی رکھتے اور کوتاہیوں کی نشاندہی کرتے تو اس سے قبل وہ اسکی خدمات کو سراہنے اور اس کی اچھائیوں کو پیش کرنے کے قائل تھے، بدقسمتی سے علمی انحطاط کے اس دور میں بہت سے لوگ اس انداز کو سمجھ نہیں پائے اور اسکو مدح وتوصیف سمجھ بیٹھے، اسی لئے بہت سے لوگوں کو میں نے خود کہتے ہوئے سنا اور لکھتے دیکھا کہ مولانا عرب کے بعض حکام (خواہ وہ نااہل ہوں) کی تائید کرتے تھے، سعودیہ سے ان کا دوستانہ تعلق تھا، ہر موقع پر انہوں نے اس کے موقف کی تائید کی، یہ سراسر غلط اور حقیقت فہمی سے دور ہونے پر مبنی خیال ہے، مولانا نے ہمیشہ حکام سے ملاقات ومراسلت ان کی اصلاح کے لئے کی، تاکہ ان تک دین اور دینی دعوت پہنچائی جاسکے، مولانا کے خطوط وخطابات اس پر دلالت کرتے ہیں، جن کے اقتباسات جابجا اندرون کتاب نظر آئیں گے، مولانا کی بے پناہ مقبولیت کے باوجود بھی صریح تنقید پر مبنی بعض مضامین پر خود حکومت سعودیہ نے حکم امتناعی نافذ کیا اور مملکت میں ممنوع قرار دیا، مولانا ہمیشہ حکمرانوں کو عمر بن عبدالعزیز اور صلاح الدین ایوبی کی مثال دیا کرتے تھے۔

درحقیقت مولانا کا اخلاص، بے لوثی اور استغناء اس درجہ کا تھا کہ اس نے انہیں نقد واصلاح کی مکمل آزادی دے رکھی تھی، کبھی وہ اپنے یا اپنے افراد خاندان اور اپنے ادارے کے لئے کوئی سوال نہ کرتے، حتی الامکان آسانی کے ساتھ کسی سے کچھ قبول نہ کرتے، بلکہ کانفرنس وغیرہ میں جاتے تو بھی منتظمین کے ذریعہ مہیا کرائی گئی قیام وطعام کی اعلیٰ سہولیات کو نظر انداز کرکے اپنے اہل تعلق کے یہاں قیام وطعام کو ترجیح دیتے اور حجاز کے سفر میں تو بیشتر یہی معمول رہا، جہاں یہ خدشہ ہوتا کہ اس سے اپنی بات کہنے یا کہنے کے بعد سننے والے پر اثر پڑنے میں کمی ہوسکتی ہے وہاں تو خاص خیال رکھتے اور آخری درجہ کے استغناء کا مظاہرہ کرتے اگرچہ یہ استغناء آپ کی عادت ثانیہ تھی، آج کی مجبوری یہ ہے کہ بسا اوقات غلط کو غلط صرف اس لیے نہیں کہا جاتا یا صحیح کی تصدیق صرف اسلئے نہیں کی جاتی کہ مولانا جیسے اصحاب دل حضرات کی سیرت کو محض واقعات وعقیدت کی بنا پر پڑھ لیا جاتا ہے، ذاتی وخاندانی مفادات پر ملی واجتماعی مفادات کی ترجیح اور استغناء و بے لوثی یوں تو عنقاء ہو چکی ہے، بڑے بڑے ادارے اور تحریکیں ان کے فقدان کا شکار ہوکر رہ گئی ہیں، بلکہ بسا اوقات تو محسوس ہوتا ہے کہ ان خصوصیات کا فقدان بر وقت اقدامات اور لازمی کوششوں، ابطال باطل اور تائید حق سے بھی روک دیتا ہے، حضرت مولاناؒ کے استغناء و بے لوثی کا یہ عالم تھا کہ شاہ فیصل سے ملاقات ہوئی، آپ نے بڑی مؤثر گفتگو کی یہاں تک کہ شاہ فیصل کی چیخیں نکل پڑیں، ملاقات کے اختتام پر شاہ فیصل نے ندوۃ العلماء کے لئے ایک خطیر رقم کی پیش کش کی تو مولانا نے اس کو نظر انداز کر دیا، شاہ فیصل ایوارڈ لینے تک نہ گئے، بلکہ مصلحتاً اس کو قبول کیا اور ساتھ ہی اس کے دعوت اسلامی

اور دینی تعلیم سے متعلق اداروں میں تقسیم کا اعلان کرادیا اور کمال حیرت ہیکہ اس رقم کا ادنیٰ حصہ بھی ہندوستان نہ آنے دیا، دبئی اور برونائی کا ایوارڈ بھی بڑے اصرار کے بعد قبول کیا اور ساری رقم اداروں اور تنظیموں میں تقسیم کردی، چندر شیکھر اور نرسمہاراؤ نے پدم بھوشن کی پیشکش کی، نرسمہاراؤ نے خودفون کرکے پیشکش کی لیکن مولانا نے اس کو خوبصورتی کے ساتھ ٹال دیا، ۱۹۸۰ء میں شاہ فیصل ایوارڈ ملنے کے بعد اسی سال دارالمصنفین میں مولانا کے لئے ان کو اطلاع دیئے بغیر ایک استقبالیہ تقریب کا اہتمام کیا گیا تو آپ نے اپنے کلمات تشکر میں ایاز کا مشہور جملہ دوہرا کر اپنی گفتگو کا آغاز کیا جو تقریباً ضرب المثل ہے، ''ایاز قدر خود را شناس''، اس جملہ کے پس منظر میں ایاز کا وہ مکمل ومنفرد واقعہ بھی نقل کیا جو بہت معروف ہے، حضرت مولانا کی یہ تواضع ان کی بلند پایہ شخصیت، حد درجہ استغناء وبے نیازی اور بے لوثی و اخلاص کی غماز ہے اور یہی سب چیزیں عظمتوں کا پتہ دیتی ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا کی شخصیت مختلف الجہات ہے، سب سے خاص جہت یہ ہے کہ وہ مفکر تھے، وقت کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے تھے، تاریخ وسیرت اور قرآن وسنت پر گہری نظر رکھنے کے سبب پیش آنے والے حالات پر محکم تبصرہ کرتے تھے، اور صحیح اسلامی موقف اختیار کرتے تھے، مولانا کی بیشتر تصانیف ایک خاص فکری خاکے کے تحت ہی لکھی گئی ہیں، مولانا کی بیشتر جہتیں خاندانی مزاج اور موروثی ذوق کا حصہ ہیں، مولانا اگر داعی تھے تو یہ ان کے خاندانی مزاج کا حصہ تھا، تصنیفی وعلمی ذوق ورثہ میں ملا تھا، خانقاہ کے ذریعہ اصلاح حال کی کوشش بھی خاندانی صفت تھی، مولانا کی پوری زندگی کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا میں تحریکی عنصر اس درجہ کا نہ تھا کہ خود کوئی تحریک چھیڑتے، مولانا نے حتی الامکان تحریکات کی صدارت وذمہ داری قبول کرنے سے اپنے کو الگ رکھا، لیکن پھر بھی ملی تڑپ اور جذبۂ دعوت سے مغلوب ہوکر جابجا آپ کی حرکیت اور طبیعت کی انقلاب پسندی ظاہر ہوجاتی تھی، اور یہی وجہ ہے کہ جب آپ کے سامنے کسی تحریک وتنظیم کا خاکہ آتا تو پھر بتقاضۂ وقت اس تحریک کا ہر ممکن تعاون فرماتے اور گویا حالات کی تبدیلی کے ساتھ تحریکات اور بروقت ومناسب اقدامات کے منتظر رہتے، سیاسی رہنمائی اور سیاسی تجزیات اور تحریکی وتنظیمی امور ومسائل میں جو بھی دلچسپی مولانا کو تھی وہ خاندان میں صرف ان کو سید احمد شہیدؒ کے واسطہ سے ملی تھی، اس حرکیت میں مولانا کے رفقاء کا بھی بڑا دخل تھا، مولانا کی تحریکی پیش رفت میں مولانا محمد منظور نعمانیؒ کی رفاقت کا ذکر بار بار آتا ہے، دیگر رفقاء کار میں مولانا محمد الحسنی اور مولانا اسحٰق جلیس ندوی رحمہما اللہ رحمۃ واسعۃ قابل ذکر ہیں جو عملی خاکے تیار کرنے میں ید طولی رکھتے تھے۔

مفکر اسلامؒ اسلام کو اقتدار میں دیکھنے کے خواہاں تھے، اس کے لیے بقدر استطاعت جو کچھ کرسکتے تھے وہ کیا، سیاسی سوجھ بوجھ پیدا کرنے کی کوشش کی، علماء کو حالات سے واقفیت اور بے لوث سیاسی خدمت وبصیرت کی ترغیب دی، کبھی امراء کو خطاب کیا کبھی بادشاہوں اور مملکت کے سربراہوں کو مخاطب کیا، خود ہندوستان کے مختلف وزرائے اعظم کو خطوط لکھے،

مولانا کی نظر میں اسلام کو اقتدار تک پہنچانے کے دو راستے تھے ایک تو یہ کہ اسلام پسند لوگوں کو کرسی تک پہنچایا جائے اور دوسرا یہ کہ کرسی والوں تک اسلام پہنچایا جائے (۱)، اسمیں کوئی شک نہیں کہ پہلا راستہ مشکل اور ٹکراؤ پیدا کرنے کا ہے اور دوسرا پرامن وپائیدار ہے، مولاناؒ نے پوری زندگی دوسرے موقف پر عمل کیا اور اپنی تمام تر کوششوں، اسفار، دوروں، خطابات، خطوط اور علمی وادبی صلاحیتوں کو اس کے لئے استعمال کیا، لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب لینا صحیح نہیں کہ مولانا پہلے راستہ کے مخالف تھے یا اسکو غلط سمجھتے تھے، انہوں نے اپنی علمی وتصنیفی زندگی کا آغاز ہی ''سیرت سید احمد شہید'' سے کیا جن کی تحریک اصلاح وتجدید کی بنیاد ہی جہاد اور قیام حکومت ہے اور جو کتاب مکمل داستان انقلاب سے عبارت ہے، ابتدا میں ہی ان پر ایسے مضامین لکھے جو ان کی داستان عزیمت اور جذبۂ صادق کے ترجمان تھے، مفصل کتاب کو بھی اس کا یہی پہلو سید احمد شہید پر لکھی جانے والی

دوسری کتابوں سے ممتاز کرتا ہے کہ اسمیں دعوت و عزیمت کے عنصر کو اجاگر کر کے پیش کیا گیا ہے، مولانا اس موقف کے مخالف کیوں کر ہو سکتے تھے جبکہ وہ موقف خود حضرت سید احمد شہیدؒ کا تھا، خود مولانا کے قلم سے نکلا کہ شہداء بالاکوٹ کا پیغام یہ ہے کہ ساری زندگی ایک ایسے قطعہ زمین کو حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے جس پر اللہ کا دین قائم کیا جا سکے، پاکستان میں ایک مرتبہ آپ نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اسلام کو اقتدار کی ضرورت ہے اس لئے کہ امر و نہی استعلاء وغلبہ کے بغیر ممکن نہیں، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں خود استعلاء کا مطالبہ کیا گیا ہے، مولانا نے ساری زندگی الاخوان المسلمون کی تائید کی اور اخوانی حلقہ نے بھی مولانا کی خوب پذیرائی کی بلکہ کہنا چاہیے اور اعتراف کرنا چاہیے کہ چوٹی کے علماء اور بڑے بڑے ادباء جنہوں نے مولانا کو سر آنکھوں پر بیٹھایا، ان میں سے اکثر کا تعلق اخوان سے تھا، مولانا آخر تک اس سحر انگیز تحریکِ دعوت کے معترف و مداح رہے، بلکہ حسن البناء کے داماد و معتمد خاص ڈاکٹر سعید رمضان کو مولانا نے اپنے گھر کا سا فرد قرار دیا اور ان سے گھر کے سے تعلق کا ذکر کیا، مولانا نے لکھا ہے کہ عربوں میں جیسا محبت و اپنائیت کا تعلق میرا ڈاکٹر سعید رمضان سے ہوا ویسا کسی اور سے نہ ہوا، اپنی جگہ پر دونوں طریقے یقیناً مؤثر اور اہمیت کے حامل ہیں، ایک کی تایید دوسرے کی نفی نہیں ہو سکتی، اور مولانا کے یہاں تو طریقہ عمل کے ساتھ دوسرے موقف کے حاملین کی تائید بھی ہے، پھر ظاہر ہے کہ تاریخ اسلام میں دونوں موقف کی مثالیں ملتی ہیں، کبھی دعوت و تبلیغ اور افہام و تفہیم ہتھیار رہے، اور کبھی دعوت پیش کرنے کے بعد غلبۂ اسلام کے لئے طاغوتوں سے پنجہ آزمائی کرنی پڑی۔

یوں تو مفکر اسلامؒ کی پوری زندگی علم و عمل اور فکر و تدبر اور یقیں محکم، عمل پیہم و محبت فاتح عالم سے عبارت ہے، لیکن مولانا کی بصیرت اور اجتماعی و ملی تڑپ کو بطور مثال پیش کرنے کے لئے بلکہ قابل تقلید نمونہ کے طور پر ایک دو چیزوں کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے، یوں تو مولاناؒ ہمیشہ پاکیزہ سیاست کی اہمیت کو سمجھتے تھے اور اس کو ایک رخ دینے کی کوشش کرتے تھے، اس کے لیے وہ عوام کے نمائندوں سے رابطہ کرتے تھے، امراء اور وزیروں سے مراسلت کرتے تھے، ممکن حد تک نقد و احتساب بھی کرتے تھے، افہام و تفہیم اور وضاحتوں کے ذریعہ راہ ہموار کرنے کی کوششیں کرتے تھے، فسادات کا بے لاگ تجزیہ کرتے تھے، مولانا نے پوری جرأت کے ساتھ ۱۹۹۰ء میں ایک مضمون میں یہ بھی لکھا کہ فسادات کے منجملہ اسباب میں سے ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ ''ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے والوں، اس کے مقابلہ میں صف آرا (Confront) ہو جانیوالوں، اور اس کو روکنے کے لئے ہر خطرہ مول لینے والوں کی کمی، خاص طور پر اس موقع پر مذہبی پیشواؤں کا میدان میں نہ آنا اور حالات سے مقابلہ نہ کرنا ہے''۔

مولانا ہمیشہ اپنے آپ کو محدود کر لینے کے خلاف رہے اور عملی اقدامات سے اس کا ثبوت دیا، مولاناؒ ''مسلم مجلس مشاورت'' کے قیام کی دعوت اور اس کی تاسیس میں نہ صرف پورے طور پر شریک رہے، بلکہ اسکے داعی اور سرپرست سمجھے گئے، اور اسکی سرپرستی کی، اس کی مجلسوں میں علالتوں کے باوجود شرکت کی اور اس کے دوروں میں شریک ہو کر انہیں مؤثر بنایا، مولانا کے جذبۂ دروں اور جذبۂ صادق اور ملی تڑپ، اجتماعی مفاد اور قومی تشخص کی حفاظت کے اشتیاق و تڑپ کی اس وقت انتہا نہ رہی جب ان کو اندیشہ ہوا کہ یہ مجلس بکھر جائے گی، اس دوران مولاناؒ سیتاپور میں تھے، آنکھ کا آپریشن ہوا تھا، ڈاکٹروں نے سفر تو دور زور سے بولنے کو بھی منع کیا تھا لیکن یہ اللہ کا بندہ جس کا مسلک تھا،

ایک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

کسی کے منع کرنے سے نہ مانے اور دہلی کا سفر اختیار کیا اور وہاں مجلس کی میٹنگ میں مؤثر تقریر کی اور اپنا دل نکال کر رکھ دیا، اس وقت تو یہ تقریر کامیاب رہی اور مجلس کسی بکھراؤ کا شکار نہ ہوئی لیکن ملت کے اس درد نے آنکھ کا ایسا درد دیا کہ وہ ضائع ہو کر رہی اور زندگی بھر اس درد کا احساس باقی رہا۔

.....(جاری)

☆☆☆

مذہب کی تبلیغ کیجئے، مسلک کی نہیں

مفتی تنظیم عالم قاسمی
استاذ حدیث دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد
mdtanzimalam@gmail.com

اسلامی شریعت رہتی دنیا تک کے لئے راہ ہدایت ہے، اس لئے اس میں وسعت رکھی گئی تا کہ قیامت تک آنے والی مختلف نسلیں بآسانی اس پر عمل کر سکیں، انہیں کسی تنگی کا شکوہ نہ ہو اور نہ وہ اس کی تنگ دامانی سے متنفر ہو کر اسلام سے محروم ہو جائیں۔ یہ وسعت اسلام کی شناخت اور پہچان ہے، ہر سطح کے افراد کی قوت وصلاحیت کو ملحوظ رکھتے ہوے اس کے احکام وضع کئے گئے ہیں گویا اسلام فطرت کی آواز ہے، یہی وجہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے اپنی زندگی میں ایک عمل کو متعدد طریقے سے انجام دیا، یہ تعدد صحابۂ کرام میں منتقل ہوا اور پھر ان کے بعد آج تک مختلف مسالک کی روشنی میں یہ تعدد اور تنوع پایا جاتا رہا ہے اور ہمیشہ موجود رہے گا۔ عشاق رسولؐ اور اہل بصیرت علمائے کرام نے اپنی تحریروں میں صاف طور پر اس کی وضاحت کی ہے کہ آج جو مسلک بھی رائج ہے اور جس پر مسلمانوں کا عمل ہے وہ حق ہے، قیامت کے دن ان تمام مسلک پر عمل کرنے والے کامیاب ہوں گے، کیوں کہ ان تمام مسلکوں کی بنیاد قرآن وسنت پر ہے، ہر امام نے مکمل احتیاط، ورع وتقوی اور اخلاص کے ساتھ نقوش نبوت کو سامنے رکھ کر مسائل کا استنباط کیا ہے، بالفرض اگر کسی نے اپنے اجتہاد میں غلطی بھی کی ہو تو وہ احادیث صحیحہ کی روشنی میں معاف ہے، ان سے کوئی مؤاخذہ نہیں ہوگا، اللہ تعالی کے یہاں نیت اور قلب صادق کا اعتبار ہے، ان تمام اجتہادات پر عمل کرنے والے مسلمان بھی اپنی صدق نیت کی وجہ سے اسلام کے پیروکار اور متبع ہدایت سمجھے جائیں گے۔ یہ اللہ تعالی کی حکمت ہے کہ اس نے بہت سی چیزوں کو مبہم رکھا، متعین طریقے سے ان میں کوئی حکم موجود نہیں، بعد میں ائمہ کرام اور فقہائے امت نے اپنی خداداد صلاحیت کی روشنی میں مسلمانوں کی ہدایت کے لئے ان احکام کی تفصیلات بیان کیں، اگر اللہ سارے مسلمانوں کو کسی ایک ہی مسلک پر جمع کرنا چاہتا تو آسان تھا، کسی ایک مسلک کو باقی رکھ کر تمام مسلکوں کو مٹا دیتا، اس طرح کسی ایک طریقے پر پوری امت مجتمع ہو جاتی مگر یہ اتحاد اللہ کو پسند نہیں اور نہ یہ شریعت میں مقصود ومطلوب ہے، رسول اکرم ﷺ سے مختلف اوقات میں مختلف عمل ثابت ہے، اللہ تعالی نے ان مسالک کے ذریعے آپؐ سے ثابت شدہ تمام عمل کو قیامت تک کے لئے محفوظ کر دیا ہے، یہ آپ کا اعزاز اور اسلام کی وسعت کی واضح دلیل ہے۔

زمانۂ جاہلیت میں اللہ کے بندے اللہ سے کٹے ہوئے تھے، وہ اپنے رب کے سامنے سجدہ کرنے کے بجائے اپنے

ہی ہاتھوں سے بنائے ہوئے پتھر کی مورتیوں کو سجدہ کرتے، ان ہی کو اپنا حاجت روا اور مشکل کشا تصور کرتے تھے' رسول اکرم ﷺ نے اپنی بعثت کے بعد سب سے زیادہ توجہ اس بات کی طرف کی کہ لوگ ایک خدا کی عبادت کرنے والے بن جائیں' بندوں کا اللہ سے تعلق جڑ جائے اور آخرت کا خوف ان کے دل میں پیدا ہو جائے۔ توحید و رسالت کی یہ دعوت پوری قوت سے پیش کرتے تھے' آپؐ یہ چاہتے تھے کہ کسی طرح یہ لوگ ایمان قبول کرلیں اور جہنم کے عذاب سے بچ جائیں' جب کفر و شرک سے لوگ باز نہ آتے اور حق قبول نہ کرتے تو آپؐ کو اس سے ناقابل بیان تکلیف ہوتی' قرآن نے اس درد کو اس طرح بیان کیا ہے فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلَى آثَارِهِمْ إِن لَّمْ يُؤْمِنُوا بِهَـٰذَا الْحَدِيثِ أَسَفا (الکہف:٦) ''تو کیا آپ ان کے پیچھے اپنے آپ کو غم کے مارے ہلاک کر ڈالیں گے اگر یہ لوگ اس تعلیم پر ایمان نہ لائیں''۔

ایمان قبول کرنے کے بعد اگر کسی سے احکام پر عمل آوری میں کمی زیادتی ہوتی تو اس قدر آپؐ ناراض نہ ہوتے، چوں کہ ایمان قبول کرنے کی وجہ سے وہ دائمی عذاب سے نجات پا گئے' جزئیات میں اگر غفلت بھی ہوئی تو اللہ تعالی معاف کردے گا، وہ اس لائق نہیں کہ کفر و شرک کا انہیں درجہ دے کر ان سے نفرت کی جائے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم ایمان قبول کرنے کے بعد آپؐ کے پیچھے نماز ادا کرتے اور ایک ہی عمل کو بیک وقت مختلف صحابہ مختلف طریقے سے انجام دیتے' کوئی رفع یدین کرتے اور کوئی نہ کرتے' ان میں کوئی ناف کے نیچے ہاتھ باندھتے اور کوئی سینے پر' یہ سب رسول اکرم ﷺ کا عمل تھا جس کو لوگوں نے اختیار کیا تھا۔ آپؐ کو صحابۂ کرام کے اس جزوی اختلاف کا علم بھی تھا لیکن کبھی آپ نے ان کو لعن طعن نہیں کیا اور نہ منع فرمایا۔ چنانچہ یہی اختلاف خلفائے راشدین کے زمانے میں رہا اور پھر بعد کے زمانے میں منتقل ہوتا رہا' اسی اختلاف پر مبنی چار مسالک کا رواج پوری دنیا میں عام ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت میں مطلوب مذہب کی تبلیغ ہے مسلک کی نہیں' ایک مسلمان جس طریقے پر بھی عمل کرے گا کامیاب ہو جائے گا بشرطیکہ اس کا سرا عمل نبویؐ سے ملتا ہو اور آج جہاں بھی مسلمان بستے ہیں ان کا عمل قرآن و حدیث کی روشنی میں ہے خواہ دوسری جماعتوں کی نظر میں استدلال درست نہ ہو۔ ہماری ذمے داری ہے کہ ہم ان لوگوں کو اپنی تبلیغ کا نشانہ بنائیں جو توحید و رسالت کے منکر ہیں' جن کو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے پر یقین نہیں' جو غیر اللہ کی پرستش کرتے ہیں اور جو اپنے حقیقی مالک سے بے خبر ہیں' ان لوگوں کو پوری قوت کے ساتھ توحید و رسالت کی دعوت دی جائے اور ان کے سامنے اللہ کا مؤثر تعارف پیش کیا جائے۔ ممکن ہے کچھ بات ان کے ذہن میں آجائے اور وہ ایمان کی دولت سے مالا مال ہو کر جہنم کے دائمی عذاب سے نجات پا جائیں' اگر ہمارے ذریعے ایک شخص بھی ایمان کی دولت سے سرفراز ہو گیا تو ہم کامیاب ہیں اور اگر کوئی ایمان میں داخل نہیں بھی ہوا تو بھی دعوت دین کے فریضے سے ہم سبکدوش ہو جائیں گے، قیامت کے دن ہم سے اس کے بارے میں مؤاخذہ نہیں ہوگا لیکن افسوس ہے کہ ہم نے اپنی یہ ذمہ داری ادا نہیں کی اور صحیح اور غیر صحیح مسلک کی بات چھیڑ کر پوری امت میں انتشار پیدا کر دیا ہے۔

ہمارے معاشرے اور سماج میں کتنے ایسے لوگ ہیں جن کے پاس ایک غیر مسلم برسوں سے ڈرائیونگ کرتا ہے یا برسوں سے مزدوری اور ملازمت کرتا ہے لیکن ایک بار بھی اس کو اسلام کے بارے میں نہیں بتایا اور نہ غیر اللہ کی پرستش

سے منع کیا' بہت سے غیر مسلم پڑوس میں رہتے ہیں شب وروز ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا ہوتا ہے اور بہت سے غیر مسلموں سے گہرے مراسم بھی ہوتے ہیں لیکن کیا ایک بار بھی ان کو سچائی کی تعلیم دی گئی اور ان کو ساری دنیا کی ہدایت کے لئے بھیجی گئی کتاب قرآن سے واقف کرایا گیا۔آپ خود اپنا جائزہ لیجئے کہ کتنے غیر مسلموں کو آپ نے توحید ورسالت کی دعوت دی اور کتنے لوگ آپ کی وجہ سے جہنم کے دائمی عذاب سے نجات پاگئے؟ برائیوں اور بے حیائیوں کا آج سیلاب ہے' بددینی اور دین بیزاری عام ہوتی جارہی ہے کیا کبھی آپ نے اس کے لئے کوئی منصوبہ بند کوشش کی' آج ملکی اور عالمی حالات نے مسلمانوں کو کرب و بے چینی میں مبتلا کردیا ہے کیا اس پر کبھی آپ نے کچھ سوچا یا کبھی آپ کی نیند اور آرام میں کوئی فرق آیا ؟ ہمارے لئے کرنے اور سوچنے کے یہ میدان ہیں' ہمیں اپنی صلاحیت اور قوت کو اس رخ پر صرف کرنا چاہئے' ایک انسان جس مسلک پر بھی عمل کرے' ہمیں اللہ کی ذات سے امید ہے کہ وہ نجات پائے گا اور اگر کچھ کمی زیادتی بھی ہوئی تو سزا پانے کے بعد ایک نہ ایک دن توحید کی وجہ سے جنت میں ضرور داخل ہوگا' ان کے مسلک کو غلط کہہ کر اپنی صلاحیتوں اور ذرائع کو ان کے پیچھے لگانا کیا یہ دانشمندانہ قدم ہے؟

یہود و نصاری نے جب پچھلے انبیائے کرام کے عقائد کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا تو قرآن نے ان کی سرزنش کی اور کہا تِلْکَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُم مَّا كَسَبْتُمْ وَلاَ تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ (البقرہ ۱۳۴)

''وہ کچھ لوگ تھے جو گذر گئے جو کچھ انہوں نے کمایا وہ ان کے لئے ہے اور جو کچھ تم کماؤ گے وہ تمہارے لئے ہے تم سے یہ نہ پوچھا جائے گا کہ وہ کیا کرتے تھے''۔

یہود کہتے کہ ہم حق پر ہیں' سارے انبیاء اسی کی تعلیم دیتے رہے ہیں اس لئے ہدایت کے لئے اس مذہب کا اختیار کرنا ضروری ہے اور نصاری کہتے کہ ہم راہ راست پر ہیں نجات کے لئے ہمارے طریقے کو اختیار کرنا ضروری ہے' اللہ تعالی نے دونوں کی باتوں کو بکواس قرار دیتے ہوے ان کو اپنی فکر کی ہدایت دی اور کہا کہ دوسرے قیامت کے دن نہ تیرے کام آئیں گے اور ان کی بدعملی سے نہ تجھے عذاب ہوگا' معلوم ہوا کہ دوسرے کا مسلک اگر غلط بھی ہے تو اس سے آپ کو کوئی نقصان نہیں ہونے والا ہے، پھر اس قدر مسلکوں کا واویلا پوری دنیا میں کیوں مچایا جارہا ہے اور جو لوگ ایسا کررہے ہیں کیا وہ اسلام کے ہمدرد کہے جاسکتے ہیں؟ آج کچھ لوگ منظم طور پر اپنے مسلک کی تبلیغ میں لگے ہوئے ہیں اور اس پر پانی کی طرح دولت لٹائی جارہی ہے اور اگر کسی نے اپنا مسلک چھوڑ کر ان کا مسلک قبول کرلیا تو سمجھا جاتا ہے کہ گویا ایک کافر کفر چھوڑ کر اسلام میں داخل ہوگیا ہے' ان کو اس پر ایسی خوشی ہوتی ہے جیسے کسی غیر مسلم کے کفر چھوڑنے پر' اس سے پورے مسلمانوں میں افراتفری پھیلتی جارہی ہے اور امت مختلف فرقوں میں مزید بٹتی جارہی ہے' ان کی قوتیں منتشر ہورہی ہیں اور مذہب کی دعوت وتبلیغ کا اصل مشن ہم سے فوت ہوتا جارہا ہے۔کاش! ہم اپنی قوت وصلاحیت کو اسلام کے فروغ میں لگائیں' اخلاقی انارکی کو دور کرنے میں صرف کریں اور اللہ کے بندوں کو مسجد کے دروازے تک پہنچانے کی کوشش کریں اور پھر ان کو اپنے حال پر چھوڑ دیں تاکہ وہ جس طرح چاہیں اپنے رب کو یاد کریں' اس سے امت میں اتحاد پیدا ہوگا' مسلمانوں سے مایوسی دور ہوگی، دنیا کو اسلام کا صحیح پیغام ملے گا اور کار نبوت کا فریضہ بھی ادا ہوگا۔

☆☆☆

تجزیہ

پیرس نشانہ کیوں؟

اوریا مقبول جان

نوٹ: اوریا مقبول جان مشہور کالم نگار اور صاحب قلم ہیں، ان کا یہ مضمون اس لیے شامل اشاعت کیا گیا کہ اس سے فرانس کی تاریخ اور اس کے کردار پر ایک سرسری نظر پڑجاتی ہے، اگر چہ انھوں نے جو نتیجہ نکالا ہے اس سے کلی اتفاق نہیں، وہ صرف ایک امکان ہے ممکن ہے ایسا ہوا ہو، میری نظر میں یہ کارروائی انتقامی ہے لیکن اسرائیل کی انتقامی کاروائی۔ (مدیر)

یہ وہ شہر ہے جس میں آج سے تقریباً ڈھائی سو سال قبل لاکھوں لوگ سڑکوں پر امڈ آئے تھے، یہ بھوکے ننگے اور غربت و افلاس کے مارے ہوئے لوگ تھے۔ عوام کی طاقت سے بادشاہت کو گرانے کا مظاہرہ دنیا نے پہلی دفعہ اسی شہر میں وقوع پذیر ہوتے دیکھا تھا۔ یہ لوگ اپنی نفرت اور انتقام کی انتہا پر تھے۔ کارلائل ان لوگوں کی تصویر کھینچتے ہوئے لکھتا ہے ''محنت و مشقت کرنے والے عوام کی حالت مسلسل ابتر تھی، بدقسمت لوگ جن کی تعداد دو سے ڈھائی کروڑ کے درمیان تھی۔ ہم ان سب کو ایک دھندلی اکائی یا انسانوں کا ایک ڈھیر سمجھتے ہیں۔ اتنا بڑا ہجوم مگر کمزور لوگوں کا ہجوم، کم ذات اور کمینے، اچھے لفظوں میں انھیں عوام کہہ لو، بظاہر عوام نام کی ایک اکائی، سارے فرانس میں اپنے مٹی کے گھروندوں اور چھپروں میں پھیلی ہوئی تھی۔ ہر گھر کے اپنے دکھ تھے، اپنے مسائل تھے، ان گھروں میں پائی جانے والی مخلوق اپنی ہڈیوں پر محض کھال اوڑھے ہوئے تھی..... کھال بھی خستہ حال کہ چٹکی بھروتو اس میں سے خون رسنے لگے''۔

یہ 1789 کا فرانس تھا جس کی تصویر کارلائل بیان کر رہا تھا۔ کئی سالوں سے فرانس کے یہ حالات تھے اور دن بدن ابتر ہو رہے تھے۔ وہ 1777 سے ہنگامے اور بغاوتیں کر رہے تھے۔ اسی سال سرکاری طور پر اعلان کیا گیا کہ فرانس میں گیارہ لاکھ بھکاری ہیں۔ لیکن دس بارہ سالوں میں یہ لوگ اسقدر بڑھے کہ لوگوں کا بازاروں میں چلنا پھرنا مشکل ہوگیا۔ پھر ایک دن چودہ جولائی 1786 میں عوام کا بپھرا ہوا ہجوم پیرس کی سڑکوں پر نکل آیا۔ انھوں نے سب سے بڑے جیل خانے بیسٹائل پر قبضہ کرلیا۔ وہ تمام قیدی جو بادشاہ کے خلاف آواز بلند کرنے کے جرم میں قید کیے گئے تھے رہا ہو گئے۔ 14 جولائی آج بھی فرانس کا قومی دن ہے۔ یہ آغاز تھا، انجام تو بہت ہی خون آشام تھا۔ جگہ جگہ عدالتیں لگی ہوئی تھیں۔ بپھرے ہوئے لوگ انسانوں کو روکتے، ان کے ہاتھ دیکھتے، اگر وہ نرم ہوتے اور ان پر محنت کے نشان نہ ہوتے تو انھیں قتل کر دیتے، ان کی قمیض کا کالر اور آستین دیکھتے، اگر ان پر میل نہ ہوتا تو گردن اڑا دیتے۔ بادشاہ کو جس طرح کھینچ کر اس بلند

مقام پر لایا گیا جہاں ایک بہت بڑا چھرا اس کی گردن کاٹنے کا منتظر تھا، وہ عجیب منظر تھا۔ جب یہ سروں کی فصل کٹ رہی تھی تو کوئی آنکھ اشکبار نہ تھی۔ پورے فرانس میں جشن کا ایک سماں تھا۔ رقص گاہوں میں رقص جاری تھے اور شراب خانوں میں جام لنڈھائے جا رہے تھے۔

انقلاب فرانس کی تاریخ لکھنے والے ان تمام واقعات کو اسی طرح بیان کرتے چلے آئے ہیں۔ وہ سب اسے عوام کا غصہ، غضب اور انتقام تصور کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ول ڈیورانٹ جیسا شخص انقلاب فرانس کے دوران اس طرح لوگوں کی گردنیں اڑانے کا ایک جواز تحریر کرتا ہے۔ وہ اپنی کتاب Heros of history میں لکھتا ہے کہ انگلینڈ میں فرانس سے زیادہ غربت وافلاس تھی بلکہ انگلینڈ کے لوگ تو پرانے چمڑوں کو ابال کر سوپ تیار کر کے زندگی گزارتے تھے لیکن وہ سب لوگ فرانس کے عوام کی طرح سڑکوں پر نہیں نکلے، انھوں نے امراء اور رؤساء کا قتل نہیں کیا۔ اس کی وجہ وہ یہ بیان کرتا ہے کہ انگلینڈ میں فرانس کے بادشاہوں کی طرح عوام کی غربت کا مذاق اڑانے والا کوئی نہ تھا۔ کسی ملکہ نے یہ الفاظ نہیں بولے تھے کہ ''لوگوں کو اگر روٹی نہیں ملتی تو وہ کیک کیوں نہیں کھاتے'' یا پھر انگلینڈ میں فوج کے کسی سپہ سالار نے فرانس کے روہان کی طرح یہ فقرہ نہیں کہا تھا کہ لوگ بھوکے ہیں تو پورے فرانس میں اسقدر گھاس اگی ہوئی ہے، وہ کیوں نہیں کھاتے۔'' یہ وہی شخص ہے جسے لوگوں نے پکڑا، اس کے منہ میں گھاس بھری اور پھر گردن کاٹ دی۔ حیرت کی بات ہے کہ لوگ بھوک اور افلاس برداشت کرتے رہتے ہیں لیکن اپنا تمسخر برداشت نہیں کرتے اور آتش فشاں کی طرح اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور قتل وغارت کی ایسی تاریخ رقم کرتے ہیں جس میں کوئی پوچھتا تک نہیں کہ کون قصوروار ہے اور کون نہیں۔ بس جو شکل وصورت یا لباس سے سرمایہ دار امیر نظر آتا ہے اس کی گردن اڑا دی جاتی ہے۔

یہ انقلاب فرانس تھا جس کی کوکھ سے دو چیزوں نے جنم لیا۔ ایک سیکولرازم اور دوسرا نپولین۔ ان کے اپنے اپنے اہداف تھے، ایک سلطنت کو وسعت دینا چاہتا تھا اور وہ افریقہ اور مشرق وسطیٰ کے مسلمان علاقوں پر چڑھ دوڑا اور سیکولرازم نے مذہب سے ایسی آزادی کو جنم دیا جس میں ہر اس تصور کا تمسخر اڑایا گیا جو مذہب سے وابستہ تھا۔ فرانسیسی ادب میں پادری اور نن کے حوالے سے جس قدر کہانیاں اور افسانے تراشے گئے وہ صرف اور صرف ان کی کردار کشی کے لیے تھے۔ لطیفوں کی ایک قطار ہے کہ ختم ہونے کا نام نہیں لیتی۔ فلموں میں چرچ کی زندگی کو نشانہ بنایا گیا' یہاں تک فحش فلموں کے کرداروں میں بھی نن کو شامل کر کے رسوائی کا سامان مہیا کیا گیا۔ عیسائیت نے چونکہ صلیبی جنگوں کے بعد فرانس پر بذریعہ چرچ اپنا غلبہ قائم کیا تھا اور پادری وہاں کی سب سے بڑی طاقت تھے جو انسانوں کو مخالف نظریات کی بنیاد پر پکڑتے، فیصلہ صادر کرتے کہ ان میں شیاطین کی ارواح داخل ہو گئی ہیں۔ پھر ان کو اکٹھا کر کے آگ کے الاؤ میں جھونک دیا جاتا۔ فرانس کے سب سے بڑے سرمایہ دار اور جاگیردار پادری تھے کیونکہ انھوں نے صلیبی جنگوں کے نام پر عوام سے جو سرمایہ اکٹھا کیا تھا اسے اپنی جائیدادیں بنانے پر خرچ کیا۔ اسی لیے جب ان کے خلاف دو صدیاں نفرت اور تمسخر سے بھرا پروپیگنڈا کیا گیا تو کوئی ان کی ہمدردی میں نہ اٹھا۔ کسی نے ان کا ساتھ نہ دیا بلکہ وہ خود بھی خاموش ہو کر بیٹھے رہے۔

چرچ کی اس خاموشی کو سیکولرازم کے کرتا دھرتا لوگوں نے آزادی واظہار کی فتح قرار دیا اور یہ گمان کر لیا کہ کسی بھی مذہب یا اس کے ماننے والوں کی محترم شخصیت کا اگر کبھی

مذاق اڑایا گیا تو کم از کم فرانس یا پیرس میں ہمارا سامنا کوئی نہیں کرے گا۔ ہم آزادئ اظہار کے نام پر سب کچھ اور سب کے ساتھ جاری رکھ سکیں گے۔ ادھر فرانس کے مفتوح افریقی اور مشرق وسطیٰ کے ممالک کے افراد یہاں آباد ہونا شروع ہوئے جن کی اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ مراکش، الجزائر، مصر، شام، لبنان اور دیگر ملک۔ ان سب نے پیرس کے اس رنگارنگ ماحول کو اوڑھ لیا جس نے سیکولرازم کی کوکھ سے جنم لیا تھا۔ اس ماحول کو ارباب اقتدار فرانسیسی تہذیب اور ثقافت کہتے ہیں اور اس کے بارے میں یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ اسے ہر حال میں قائم رکھا جائے گا بلکہ ان سیکولر اخلاقیات کو بزور نافذ کیا جائے گا۔ اس کا پہلا شکار وہ 92 عورتیں ہوئیں جو پیرس شہر میں نقاب اوڑھتی تھیں۔ ان کے بارے میں کہا گیا کہ یہ فرانسیسی تہذیب و ثقافت پر حملہ ہے۔ ان 92 عورتوں کے مقابلے میں فرانس کی اسمبلی کے کئی سو ارکان اکٹھا ہوئے اور نقاب پر پابندی لگا دی۔ یہ کسی شخص کے ذاتی انتخاب لباس پر قدغن ہی نہیں بلکہ اس کا تمسخر اڑانا بھی تھا۔ اس کے بعد چارلی ہیڈو نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کارٹون شائع کیے۔

اس اخبار کو بخوبی علم تھا کہ فرانس میں پچاس لاکھ سے زیادہ مسلمان رہتے ہیں اور اسے یہ بھی اندازہ تھا کہ فرانس یورپ کا وہ واحد ملک ہے جہاں اسلام اختیار کرنے والوں کی تعداد روزانہ تین سے چار افراد ہے جو اپنا مذہب چھوڑ کر مسلمان ہو رہے ہوتے ہیں۔ لیکن کسی کو یاد نہ تھا کہ لوگ غربت و افلاس اور بھوک اور بیماری برداشت کر لیتے ہیں لیکن تمسخر نہیں۔ 2015ء میں چارلی ہیڈو کے کارکن قتل ہوئے۔ اسی پیرس شہر میں جہاں ڈھائی سو سال قبل انتقام سے بھرپور لوگوں نے اپنے تمسخر کا انتقام ہر قصوروار اور بے قصور سے بلا امتیاز لیا تھا۔ پورا یورپ وہاں اکٹھا ہو گیا۔ ان کے ساتھ یک جہتی کا مظاہرہ کیا گیا۔ پیرس کی سڑکوں پر ایک ہجوم دوبارہ نکل آیا۔ لیکن اس دفعہ وہ تمسخر اڑانے والوں کی گردنیں کاٹنے کے حق میں نہیں تھا۔ بلکہ ان کے تحفظ اور ان کی حمایت میں کھڑا ہو گیا۔ اس ہجوم نے دنیا بھر کے دکھی اور رنجیدہ مسلمانوں کو ایک پیغام دیا کہ پیرس ہر اس شخص کا ساتھ دے گا جو تمہاری محبوب ترین شخصیت کا تمسخر اڑائے اور اگر وہ قتل کر دیا جائے تو وہ ہمارا ہیرو ہے۔ انتقام کی اپنی سرشت ہوتی ہے۔ الجزائر میں فرانسیسی افواج اتریں کہ وہاں اسلام پسند حکمران نہ بن جائیں، بلا امتیاز بچوں، عورتوں اور بوڑھوں کو قتل کیا۔ لیبیا کے پرامن ملک کو فضائی حملوں سے تباہ و برباد کر دیا گیا۔

عراق، بیروت، مصر اور شام میں اپنے اتحادیوں کے ساتھ وہ سب کچھ روا رکھا گیا جو عام شہریوں کے قتل عام کا سبب تھا۔ جہاز کئی ہزار فٹ سے بم برساتے اور ان کے شور میں کسی کو معصوم بچوں، عورتوں اور بوڑھوں کی چیخیں تک سنائی نہ دیتیں۔ لوگ گھروں سے نکلے، ہجرت کرتے ہوئے سمندروں میں غرق ہوئے، دربدر خاک بسر ان لوگوں کی آنکھوں میں صرف ایک ہی آگ تھی جسے انتقام کی آگ کہا جاتا ہے جس شخص نے اپنے ہاتھوں اپنے پیاروں کو دفنایا ہو اسے ارد گرد خوشیاں مناتے لوگ اچھے نہیں لگتے۔ وہ ذاتی اور نسلی انتقام کی آگ میں جل رہا ہوتا ہے۔ وہ شام سے تعلق رکھتا ہے اور شام کا انتقام لیتا ہے۔ شام جس پر پورا مغرب اور روس سب ٹوٹ پڑے ہیں۔ لیکن فرانس کا شہر پیرس کیوں۔ اس لیے کہ یہی شہر تھا جہاں دنیا بھر کے حکمران تمسخر اڑانے والوں کے ساتھ یک جہتی کے لیے جمع ہوئے تھے اور ول ڈیوزنٹ کے نزدیک لوگ بھوک برداشت کر لیتے ہیں، تمسخر نہیں۔

☆☆☆

زبان وادب

سیرت سید احمد شہید- ایک مطالعہ
اسلامی سوانحی ادب کے زاویے سے

مولانا محمد علاء الدین ندوی
استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنو

سوانح حیات کسی شخص کی زندگی کے حالات بیان کر دینے کا نام ہوسکتا ہے مگر وہ سوانحی ادب اسی وقت ہوگا جب فن کے تقاضوں مثلاً؛ تاریخی صداقت، فنی جمالیات اور ادبی شان کو ملحوظ رکھا گیا ہو، اگر کسی کی زندگی کے کارناموں کی مکمل تفصیل اور تفصیلی واقعات جاننے کے بعد بھی پڑھنے والا گہرا اثر اور واضح تصور وتصویر اخذ نہین کرتا تو وہ سوانحی ادب نہیں سوانح عمری ہے۔ کبھی تاریخ اور سوانح عمری ایک ہی سمجھے جاتے ہوں گے مگر اب ان دونوں میں فرق ہے۔

'' تاریخ میں مختلف اشخاص کے کارناموں اور قوموں کے عروج وزوال کی داستان ہوتی ہے اور سوانح نگاری میں صرف ایک ذات کی تاریخ، اشخاص کی سوانح تاریخی مواد کی حامل ہوسکتی ہے مگر تاریخ کسی شخص واحد کی سوانح حیات نہیں ہوسکتی''(۱)۔

پھر سوانح عمریاں اگر فنی محاسن اور ادبی جمالیات سے عاری ہوں تو وہ اشخاص کی تاریخی دستاویز ہوسکتی ہے ادبی زمرے میں نثر فنی کا درجہ نہیں پاسکتیں، ہم نے ''سیرت سید احمد شہید'' کا انتخاب اس نقطۂ نظر سے کیا ہے کہ وہ ایک صاحب طرز ادیب کے نثری اسلوب کا جیتا جاگتا فن پارہ ہے، کتاب کے بیشتر مقامات پر طلسم آفریں قلم کا گمان ہوتا ہے، مواد اور ہیئت کے لحاظ سے یہ بے حد اثر انگیز، حلاوت سے بھر پور اور ایک سائیکلوپیڈک کتاب ہے، سید صاحب کی زندگی کے ۴۶ سالہ سفر کے جہد مسلسل، روحانی، دعوتی اور جہاد فی سبیل اللہ کی تصویر ہے جس میں زندگی خود تموج پذیر ہوگئی ہے، ڈاکٹر سید عبدالباری کہتے ہیں:

''ہمارے نثری ادب کی خوش نصیبی تھی کہ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ جیسا مورخ اور سوانح نگار منصۂ شہود پر آیا، جس نے سیرت سید احمد شہید لکھی اور وہیں سوانح نگاری کے معیار کو رفعت اور اس فن کو وزن ووقار عطا کیا''(۲)۔

سیرت سید احمد شہید سیرت وتذکرہ نگاری کی فہرست میں ایک گراں قدر کتاب ہے، اس کتاب کی سطر سطر میں جس اسلامی شخصیت کے مجاہدانہ کارناموں کی روداد بیان ہوئی ہے وہ ۱۲۰۱ھ میں چاند بن کر رائے بریلی کے سادات کے خاندان میں طلوع ہوا تھا جو آگے چل کر مجاہدہ وعرفان کا آفتاب بن گیا اور اسی ایک آفتاب کے پرتو سے لاکھوں زرے چمک اٹھے، اس خاندان کے تعارف میں علامہ سید سلیمان ندویؒ کے یہ الفاظ آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں، وہ فرماتے ہیں:

''مجدد سرہندیؒ اور مجدد دہلویؒ کے فضل وکمال اور مجاہدہ وحال کے دو آتشے سے رائے بریلی کے خمکدے میں ایک اور سہ آتشہ تیار ہوا، یہ سادات حسنی کا خاندان تھا جس میں مجدد الف ثانیؒ اور حضرت شاہ ولیؒ اللہ کی تعلیمات کا فیض آکر مل گیا تھا.....اس خاندان کے ممتاز افراد مجدد دہلویؒ کے فیض سے مستفیض اور مشرق کے دیار میں ان کے خلیفۂ خاص تھے، اس خاندان کے ممتاز افراد مجدد دہلویؒ کے فیض درس اور فیض صحبت سے سیراب تھے، اس طرح اس خاندان میں حضرت مجدد سرہندیؒ اور مجدد دہلویؒ کی برکتیں اور سعادتیں جمع ہوگئیں''(۳)۔

جن فنی محاسن کی وجہ سے یہ کتاب سوانحی ادب میں ایک مایہ ناز کتاب قرار پائی ہے، راقم کی نظر میں اس کے چند وجوہات ہیں؛

اول: اس میں ایک باکمال اور یکتائے روزگار شخصیت کا انتخاب کیا گیا ہے، جو اپنے عظیم کارناموں کی وجہ سے قابل اتباع اور مشعل راہ قرار پائی ہے، اس کی زندہ اور پرکشش شخصیت خوابیدہ روحوں کو بیدار اور سرد جذبات کو دہکاتی ہے، اس کی مربیانہ، مصلحانہ، مجاہدانہ اور سرفروشانہ کوششوں میں خالص اسلامی زندگی کا پیغام مضمر رہا ہے اور اس پیغام کا انداز پیش کش نبوت محمدی کے حکیمانہ اسلوب سے ماخوذ تھا، اور اس اسلوب دلبر میں بجلی کی سی تاثیر تھی، اس تاثیر کا نظارہ تاریخ کی آنکھوں نے کیا کہ لاکھوں انسانوں کے دل زیروزبر ہوگئے۔ سوانح نگار نے اپنی پسندیدہ شخصیت کے اندر دہکتی ہوئی ایمانی آگ کو اپنے شعوری تجربہ اور تخلیقی صداقت کی طاقت سے شعلہ اور شرر بنادیا ہے۔

دوم: سوانح نگار کو صاحب سوانح کی شخصیت اور افکار ونظریات سے ذہنی اور فکری ہم آہنگی ہے، اس کا دل اپنی محبوب شخصیت کی محبت وعقیدت کے جذبات سے معمور ومخمور ہے، پوری کتاب شاہد ہے کہ اس عقیدت ومحبت میں غلو سے کام لے کر کہیں رنگ آمیزی نہیں کی گئی ہے، واقعات کے بیانیہ میں سحر آفرینی اور مبالغہ آرائی کے ذریعہ راست اور فطری قد وقامت کو بڑھایا نہیں گیا ہے، بلکہ شخصیت کو وہی لباس پہنایا گیا ہے جو اس کے قد راست کو سجتا اور پھبتا ہو۔ حضرت سید احمد شہیدؒ نے جہاد ومجاہدہ اور حرب وقتال کی راہ اپنا کر اسلامی زندگی کا احیاء اور خلافت علی منہاج النبوۃ کی اساس پر اسلامی حکومت کا قیام چاہا تھا، مصنف نے اس مصلح ومجدد کی سیرت وسوانح لکھ کر ملت کے شریانوں میں غیرت ایمانی اور حمیت دینی کے لہو کو تیز کر کے امت کو حیات تازہ کا پیغام دیا ہے۔

سوم: پوری کتاب میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ملتا جو عقل وشعور کے معیار پر پورا نہ اترتا ہو، غیر مستند واقعات اور کمزور بیانات کا سہارا لے کر کہیں صاحب سیرت کو تابناک بنانے اور کرامات کے ہالے میں سجانے کی کوشش نہیں کی گئی ہے، بلکہ صاف محسوس ہوتا ہے کہ ایک زندہ انسان نے ایک زندہ دل انسان کے حالات زندگی بیان کئے ہیں۔ کتاب کی دو جلدیں تقریباً ۱۲۰۰ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے، اس طوالت کے باوجود پوری کتاب ایک سلیم الخلقت، سڈول قامت، خوبصورت جسم والے رعنا نوجوان کی طرح مربوط، ہم آہنگ، ٹھوس اور مستحکم ہے۔ ہمارے پیش نظر چونکہ سوانح عمری کی تاریخی صداقت نہیں ادب کی فنی وتخلیقی صداقت پیش نظر ہے اور اہل ذوق وارباب فن جانتے ہیں کہ فنی صداقت خارجی صداقت اور حقیقت نفس الامری سے جداگانہ شئے ہے، اس لئے ہم نے خارجی صداقت پہ اصرار کرنے کے بجائے فنی صداقت کو قابل اعتناء سمجھا ہے۔

چہارم: مصنف کو مدح وستائش اور تعریف وتوصیف کے ذخیرہ الفاظ کے ٹمپریچر کا گہرا ادراک ہے، پھر وہ ایک نفیس ادبی ذوق کے حامل تذکرہ نگار ہیں جو نام ونمود اور گروہی عصبیت سے پاک ہیں، بلکہ خود صلاح، تقوی، علم، دیانت، شرافت اور اخلاق کریمانہ کی دلآویز مثالی شخصیت کے حامل ہیں۔

ادب ایک ناقابل تسخیر طاقت ہے، یہ طاقت تعمیر کے لئے بھی استعمال ہوتی آئی ہے جس طرح اسے آج بڑی حد تک تخریب کے لیے استعمال کیا جارہا ہے، دنیا کے بڑے بڑے انقلابات میں اس طاقت سے کام لیا گیا ہے، اصلاح وتجدید اور جہاد وقتال اور انقلابی تحریکوں میں یہ ایک کارگر ہتھیار کے طور پر استعمال ہوتی رہی ہے۔

مولانا اپنی نثر کو سنوارتے نہیں، نہ ہی موثر اور دلفریب بنانے کے لئے شعوری کدوکاوش کرتے ہیں، بلکہ یہ درون باطن کے سوتے سے رواں دواں پہاڑی ندی کی طرح کبھی سنگ گراں سے ٹکراتی، کبھی وادیوں کو شاداب کرتی بے اختیار بہتی ہے، مولانا کی نثر کا بیش بہا حصہ ادبی جمالیات اور فکری لطافتوں سے آراستہ ہوتا ہے، وہ سلیس شگفتہ اور دلپذیر زبان لکھتے ہیں، آپ کے اسلوب میں وقار ومتانت اور فکر میں رفعت وثقاہت ہوتی ہے، وہ خود بھی خود اعتمادی کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتے ہیں اور اپنے قاری کو ہمدوش وہمسفر رکھتے ہیں، مگر سیرت سید احمد شہید میں تو شعلے کی لپک، طوفانوں کا خروش اور سمندر کی جولانی ہے، بات یہ ہے کہ امیر المومنین سید احمد شہیدؒ کے انقلابی جہاد اور تجدیدی

کارناموں کے جلال و جمال اور ان کارناموں کے عقب میں چھپی غیرت وحمیت نے مولانا کے قلم میں ولولہ تازہ اور سرور و ابتہاج کی لہریں دوڑادی ہیں، اس کم سواد مقالہ نگار کو نہیں معلوم کہ سوانح عمریوں کے انبار میں ایمان ویقین کے جذبات میں برقی رو دوڑا دینے کی طاقت اس دلنشیں سوانح سے بڑھ کر شاید کوئی دوسری سوانح عمری ہو، ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی لکھتے ہیں:

''مصنف نے موثر و دلنشین واقعات کا ایسا مجموعہ پیش کیا ہے جو ایمان میں حرکت، قلب میں حرارت اور آنکھوں میں جلتے آنسو پیدا کرتا ہے'' (۴)۔

شیخ عبدالقادر جیلانی کے خطبوں کے بارے میں حضرت مولانا کا تاثر یہ ہے کہ:

''آج تک ان کے خطبے پڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ بادل گرج رہے ہیں اور بجلیاں کڑک رہی ہیں اور کوندرہی ہیں اور ایک شخص ہے جو گرز چلا رہا ہے اور اس سے باطل کے سارے طلسم ٹوٹتے چلے جارہے ہیں'' (۵)۔

تقریباً یہی باتیں حضرت سید احمد شہید کی دعوتی، اصلاحی اور جہادی سبیل اللہ کے تگ وتاز میں صادق آتی ہیں، خود مصنف فرماتے ہیں:

''ناچیز مصنف نے وقائع احمدی میں سے ان موثر واقعات کا زیادہ سے زیادہ تعداد میں انتخاب کیا اور ان کی زبان میں بھی کم سے کم تغیر کیا تاکہ ان کی سادگی و دلآویزی قائم رہے، مصنف نے اپنے قارئین کو اپنے تاثرات میں شریک کرنے کی کوشش کی ہے اور ان موثر و دلنشین واقعات کا بڑا مجموعہ پیش کر دیا ہے جو آج بھی ایمان میں حرکت، دل میں حرارت، اور آنکھوں میں اشک ندامت پیدا کرتا ہے۔

ہم نے اپنے آشیانے کے لئے
جو چبھے دل میں وہی تنکے لئے'' (۶)

مولانا نے جس ذوق شوق اور ذاتی وجذباتی تحریک کی بناء پر یہ کتاب لکھی ہے کوئی دوسری کتاب نہیں لکھی، فرماتے ہیں:

''جس ذوق شوق سے یہ کتاب لکھی کوئی کتاب نہیں لکھی، اس کتاب نے کسی اور کو کوئی فیض پہونچایا ہو یا نہ پہونچایا ہو، اس نے خود مصنف کو حلاوت ایمانی سے لذت یاب کیا، اس نے ان اہل یقین اور ارباب عزیمت سے متعارف کیا جن کی نظیر اسلام کی پچھلی صدیوں میں آسانی سے نہیں ملتی'' (۷)۔

تاریخ اور سوانح نگاری میں ایک تلازم بھی ہے اور ایک دوسرے سے جداگانہ بھی، تاہم کسی شخصیت کا مرقع تیار کرتے ہوئے تاریخ سے کسی صورت گریز اختیار نہیں کیا جاسکتا، مولانا انیسویں صدی کے ہندوستان کی سیاسی، مذہبی، اخلاقی حالت کا جائزہ لیتے ہوئے جب کہ سلطنت مغلیہ کا شیرازہ بکھر چکا تھا اور ہندوستان ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر تسلط کراہ رہا تھا، تاریخ نویسی اور مرثیہ نگاری کے امتزاج فن کے کمال کا مظاہرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں

''زوال سلطنت کہنے کو تو دو لفظ ہیں لیکن یہ کسی قوم اور ملک کی تاریخ میں قیامت سے کم نہیں، سلطنت کو کمزور پا کر بیسیوں فتنوں نے سر اٹھایا، دکن سے لے کر دہلی تک کا ملک اور جو کچھ ملک میں ہوتا ہے مرہٹوں کے رحم وکرم میں تھا، پنجاب سے لے کر افغانستان کے حدود تک سکھوں کا راج تھا، جن کی تاخت اور دست برد سے ہندوستان کا شمالی اور وسطی حصہ بھی محفوظ نہ تھا، دہلی اور اطراف دہلی مرہٹوں کی غارت گری کا نشانہ بنتے رہتے تھے اور یہ سب جب چاہتے تھے اس آباد اور مرکزی علاقے کو گھوڑوں کی ٹاپوں سے روندتے، مال واملاک کو لوٹتے اور شہری شرفاء ومعززین کو بے عزت کرتے چلے جاتے، شہروں کی زندگی میں تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد یہ مدوجزر آتے رہتے اور کوئی سکون کے ساتھ زندگی نہ گزار سکتا، اس قسم کا جو سیلاب بھی آتا وہ دہلی کے سر پر سے ضرور گزرتا، اس لئے وہاں سب سے زیادہ انتشار رہتا، مرہٹوں سکھوں اور جاٹوں کے حملے کے وقت شہر کے پرامن باشندے اور شرفاء قصبات اور دیہات کی طرف منتقل ہو جاتے، حملہ آوروں اور غارت گروں کے سیلاب کے نکل جانے کے بعد پھر واپس آجاتے'' (۸)۔

اس زوال پذیر عہد میں ایک امام، ایک مصلح ومجدد کی ضرورت تھی وہ امام کن صفات کا ہونا چاہئے، اس کے کام کی نوعیت کیا ہونی چاہئے، اس کی خداداد صلاحیتوں کو کہاں ٹھکانہ ملنا چاہئے، اس کے

انقلاب کے کیا کیا دوررس اثرات مرتب ہونے چاہئیں، ان سب کا دلآویز تذکرہ رجائی ادب کے پیرائے بیان میں ملاحظہ ہو:

''اس وقت ایک ایسے امام کی ضرورت تھی جو دین وعلم اور صلاحیتوں کے اس بچے کھچے سرمائے سے وقت پر کام لے لے، جو خانقاہوں کا حال اور درسگاہوں کا قال، وہاں کی حرارت اور یہاں کی روشنی سارے ملک میں عام کردے، جس کے جلو میں چلتی پھرتی خانقاہیں ہوں اور دوڑتے بھاگتے مدرسے، گھوڑوں کی پیٹھ پر عالم ہوں اور محرابوں میں مجاہد۔

جو دلوں کی بجھی ہوئی انگیٹھیاں دوبارہ دہکادے، افسردہ دلوں کو ایک بار پھر گرمادے اور ملک میں اس سرے سے اس سرے تک طلب اور دین کی تڑپ کی آگ لگا دے، جو مسلمانوں کی خداداد قابلیتوں اور فطری صلاحیتوں کو ٹھکانے لگائے، جس کی سعی سے شجاعت ودلیری کا رخ میدان جہاد اور حقیقی دشمن کی طرف پھر جائے، جذبۂ وفاداری، خداوند حقیقی کی بندگی میں لگ جائے .....ذہانت وطباعی، دعوت اصلاح کی حکمت، امور جماعت میں معاملہ فہمی وفراست، میدان جنگ کی تدبیر اور حکومت اسلامی کی دینی سیاست میں اپنے جوہر دکھائے، جس کی نگاہ دوررس، جس کی ذات مسیحانفس، جو کسی بے کار چیز کو بھی بے کار نہ سمجھے اور کسی بے جان کو بھی مردہ نہ کہے اور جو امت کے ذخیرے کے ہر دانے اور اس کے خیاباں کے ہر تنکے سے پورا پورا کام لے لے، جس کے متعلق ساری دنیا کا فیصلہ ہو کہ یہ کسی مصرف کا نہیں، اس کی نگاہ کا فیصلہ ہو کہ یہی سب سے بڑھ کر کارآمد ہے، جس پتھر کو ہر معمار رد کر چکا ہو، وہ کہے کہ یہی کونے کا پتھر ہے جو ساری عمارت کا بوجھ اٹھا سکتا ہے، وہ سنگریزوں سے دیکھتے دیکھتے ایسا کحل الجواہر تیار کردے جو ہزاروں آدمیوں کی آنکھیں کھول دے اور عالم کو روشن کردے، جو منتشر افراد سے منظم جماعت، پراگندہ اوراق سے مکمل کتاب، کچے بلکہ گلے ہوئے مال سے بہترین مصنوعات تیار کرے، متضاد عناصر، مختلف مزاجوں اور مقابل طبائع کو آپس میں جوڑ کر ان کے اختلاف وتنوع سے نئی قوت حاصل کرے اور ان کو شیر وشکر کردے، ہر قابلیت اور ہر ہنر سے دین کا کام لے، شعراء کی شاعری کو حق کے دفاع میں، علماء کی قوت استدلال کو حق کے اثبات اور دماغوں کی سلوٹ دور کرنے میں، اہل باطن کی قلبی قوت کو دین کے سپاہیوں اور کارگزاروں کی تربیت وتزکیۂ نفس اور دلوں کی گرہ کھولنے میں، اہل قلم کی تصنیفی قابلیت وقوت تحریر کو توحید وسنت کی اشاعت اور جہاد کی ترغیب وتحریض میں، مقرروں کی گویائی وخطابت کو دین کی دعوت اور نفیر عام میں، دولت مندوں کی دولت کو مجاہدین کا سامان درست کرنے میں صرف کرے، غرض ہر پرزے کو دین کی مشین میں لگائے اور اپنی اصلی جگہ پر جمائے، پھر ہٹی ہوئی چول کو اپنی جگہ پر لاکر مشین کو اس طرح حرکت دے کہ زندگی کا پورا محور گھوم جائے، جو شخص ان اوصاف کا جامع ہو اس کو اسلام کی بلیغ معجز اصطلاح میں ''امام'' کہتے ہیں اور اس کی جگہ تیرہویں صدی کے تمام اہل کمال اور مشاہیر رجال کی موجودگی میں خالی تھی''(۹)۔

مولانا کی تحریروں میں دلآویزی کے ساتھ بے ساختگی کا حسین رچاؤ ہوتا ہے اور دونوں ایک دوسرے سے گلے ملتے نظر آتے ہیں، یہاں صرف ایک مثال پر اکتفا کی جاتی ہے۔

''اپنے سات عزیزوں کے ساتھ لکھنؤ چلے، لکھنؤ راے بریلی سے انچاس میل ہے، سواری صرف ایک ہی تھی، اور باری باری اس پر سوار ہوتے تھے، لیکن جب آپ کی باری آتی تو آپ سوار نہ ہوتے، بلکہ منت سماجت کر کے دوسرے کو سوار کر دیتے، ہر ایک کے سر پر اس کا سامان بھی تھا، جب آدھی منزل طے ہوگئی تو سب رفقائے سفر تھک گئے اور مزدور کی جستجو ہوئی، لیکن مزدور نہ مل سکا، سید صاحب نے جو ایسے موقع کی تلاش میں رہتے تھے، اپنے ساتھیوں سے بڑے عجز وانکسار سے کہا: اس خاکسار کی ایک عرض ہے، اگر آپ سب اسے قبول کرنے کا وعدہ فرمائیں تو عرض کروں'' لوگ مطلب نہیں سمجھے اور کہا: بڑی خوشی سے۔ آپ نے فرمایا: نہیں پختہ وعدہ کیجئے، سب نے پختہ وعدہ کیا، آپ نے کہا سارا سامان ایک کمبل میں باندھ کر میرے سر پر رکھ دیجئے، میں انشاء اللہ پہنچادوں گا، چونکہ لوگ زبان دے چکے تھے، مجبور ہو کر انہوں نے ایسا ہی کیا، اور آپ ایسے خوش ہوے جیسے کوئی بڑی دولت ملی اور فرمایا: عمر بھر آپ کا

یہ احسان نہیں بھولوں گا، اور ہنستے بولتے لکھنؤ پہنچ گئے" (۱۰)۔

"سیرت سید احمد شہید" سوانحی ادب میں ایک معیاری تصنیف ہے اور ایک مثالی اسلامی شخصیت کی تب وتاب زندگی کے مکمل تذکرہ پر مبنی ہے اور فکر ونظر اور جہد وعمل کا آئینہ جو کسی شخصیت کی خاکہ نگاری سے بلند تر شئی ہے۔

مولانا کی پیکر تراشی میں ایماندارانہ احساس جگمگاتا ہے، وہ حقائق و واقعات کی ایسی تصویر دکھاتے ہیں کہ انسانی کردار حرکت پذیر ہو جاتا ہے۔ ۱۲۲۳ھ میں حضرت نے دہلی کا تیسرا سفر کیا تھا، اس سفر میں مضافات دہلی اور مغربی یوپی کے مختلف مقامات کے دعوتی دورے فرمائے تھے "سفر کے برکات واثرات" کے عنوان سے مصنف کی فنکارانہ مہارت سے تراشی گئی ایک تصویر وتمثیل ملاحظہ ہو:

"آپ کا یہ پورا سفر باران رحمت کی طرح تھا کہ جہاں سے گزرتا ہے سرسبزی وشادابی، بہار وبرکت چھوڑ جاتا ہے، دیکھنے والوں کا متفقہ بیان ہے کہ جہاں آپ تھوڑی دیر ٹھہر گئے وہاں مساجد میں رونق، اللہ رسول کا چرچا، ایمانوں میں تازگی، اتباع سنت کا شوق، اسلام کا جوش پیدا ہو گیا اور کہیں کہیں شرک و بدعت اور رفض کا بالکل خاتمہ ہو گیا" (۱۱)۔

۱۲۲۴ھ کو حضرت مع تمام رفقاء رائے بریلی تشریف لائے "رائے بریلی کا قیام" کے عنوان سے حضرت مولانا تحریر فرماتے ہیں:

"رائے بریلی کا یہ قیام، مجاہدہ وتربیت اور جسمانی و روحانی مشغولیت وخدمت کا خاص دور تھا، سید صاحب بھی عام لوگوں کے ساتھ مشقت کے کاموں میں شریک ہوتے، لکڑیاں چیرتے، بوجھ اٹھاتے، یہ زمانہ بڑت روحانی وعلمی فیوض وبرکات کا زمانہ تھا، سید صاحب کا وجود، علماء و مشائخ ہندوستان کا اجتماع، یکسوئی، یہ سب نعمتیں جمع تھیں جو کم جمع ہوتی ہیں، ایک غیر معروف چھوٹا سا گاؤں کہکشاں بن گیا تھا، جس کی زمین پر چاند کے ساتھ سارے روشن ستارے اتر آئے تھے، ہندوستان کے منتخب اور نامور علماء ومشائخ .....ایک وقت میں جمع تھے۔ یہ قیام عجیب ذوق وشوق، لذت وحلاوت اور جفاکشی کا تھا اور مہاجرین کے قیام مدینہ منورہ سے بہت مشابہ تھا" (۱۲)۔

مولانا زبان وبیان اور قرطاس وقلم کی طاقت سے صرف نظر کر ہی نہ سکتے تھے، مگر سوال یہ ہے کہ وہ طاقت کہاں سے آتی ہے، یا مولانا کی تصنیفات ونگارشات میں اسلامی قدروں میں مبنی ادب کی یہ جلالتِ شان کہاں سے پیدا ہو گئی ہے، اس کا جواب خود مولانا کی بصیرت مند تحریر میں مل جاتا ہے، فرماتے ہیں:

"ادب و انشاء کے سلسلے میں عام مورخ و نقاد اکثر اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ تحریر کی قوت، کلام کی تاثیر اور قبول عام وبقائے دوام کے لئے سب سے زیادہ معاون عنصر لکھنے والے کی اندرونی کیفیت، اس کا یقین، دلی جذبہ، کسی حقیقت کے اظہار کے لئے اس کی بے چینی اور بے قراری ہے، ایسے کسی شخص کو جو اس اندرونی کیفیت سے سرشار اور اس کو دوسروں میں پیدا کرنے کے لئے مضطرب و بے قرار ہو جب قدرت کی طرف سے ذوق سلیم بھی عطا ہو، الفاظ و اسالیب بیان پر ضروری حد تک قدرت بھی رکھتا ہو اور اس کی تحریر میں علم وادب، عقل واستدلال اور حسن بیان کے ساتھ سوز دروں اور خون جگر بھی شامل ہو تو، اس کی تحریر میں ایسا اثر اور ایسا زور پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے زمانے میں ہزاروں دلوں کو زخمی کرتی ہے اور سیکڑوں برس گزر جانے کے بعد بھی اس کی تازگی وزندگی اور اس کی تاثیر وقوت تسخیر قائم رہتی ہے، (۱۳)۔

سوز دروں اور خون جگر سے لکھی ہوئی اور حجازی لے اور محبت کی سیل رواں میں ڈوبی ہوئی ایک سحر طراز تحریر سے آپ بھی محظوظ ہوں، شہدائے بالاکوٹ کو خراج عقیدت ومحبت کا نذرانہ پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اس معرکے میں وہ پاک نفوس شہید ہوئے جو عالم انسانیت کے لئے رونق وزینت اور مسلمانوں کے لئے شرف وعزت اور خیر و برکت کا باعث تھے، مردانگی و جواں مردی، پاکیزگی و پاکبازی، تقدس وتقوی، اتباع سنت وشریعت اور دینی حمیت و شجاعت کا وہ عطر جو خدا جانے کتنے باغوں کے پھولوں سے کھینچا گیا تھا اور اسلام کے باغ کا جیسا "عطر مجموعہ" صدیوں سے

تیار نہیں ہوا تھا اور جو ساری دنیا کو معطر کرنے کے لئے کافی تھا،۲۴ ذو القعدہ ۱۲۴۶ھ کو بالاکوٹ کی مٹی میں مل کر رہ گیا،مسلمانوں کی نئی تاریخ بنتے بنتے رہ گئی،حکومت شرعی ایک عرصہ تک کے لئے خواب بے تعبیر ہوگئی،بالاکوٹ کی زمین اس پاک خون سے لالہ زار اور اس گنج شہیداں سے گل زار بنی جس کے اخلاص وللّٰہیت جس کی بلند ہمتی اور استقامت ،جس کی جرأت و ہمت اور جس کے جذبۂ جہاد اور شوق شہادت کی نظیر پچھلی صدیوں میں ملنی مشکل ہے،بالاکوٹ کی سنگلاخ و ناہموار زمین پر چلنے والے بے خبر مسافر کو کیا خبر کہ یہ سرزمین کن عشاق کا مدفن اور اسلامیت کی کس متاع گراں مایہ کا مخزن ہے۔

یہ بلبلوں کا صبا مشہد مقدس ہے
قدم سنبھال کے رکھیو یہ تیرا باغ نہیں

اللہ کے کچھ مخلص بندوں نے ایک مخلص بندے کے ہاتھ پر اس کی رضا اور اس کے نام کی بلندی اور اس کی دین کی فتح مندی کے لئے آخری سانس تک کوشش کرنے اور اس راہ میں اپنا سب کچھ مٹا دینے کا عہد کیا تھا،جب تک ان کے دم میں دم رہا اسی راہ میں سرگرم رہے،بالآخر اپنے خون شہادت سے اس پیمانہ وفا پر آخری مہر لگا دی،یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ۲۴ ذوالقعدہ کا دن گزر کر جو رات آئی وہ پہلی رات تھی،جس رات کو وہ سبک دوش وسبک سر ہو کر میٹھی نیند سوئے۔

وہ خلعت شہادت پہن کر جس کریم کی بارگاہ میں پہنچے،وہاں نہ مقاصد کی کامیابی کا سوال ہے،نہ کوششوں کے نتائج کا مطالبہ،نہ شکست و ناکامی پر عتاب ہے،نہ کسی سلطنت کے عدم قیام پر محاسبہ،وہاں صرف دو چیزیں دیکھی جاتی ہیں،صدق واخلاص اور اپنی مساعی اور اپنے وسائل کا پورا استعمال،اس لحاظ سے شہدائے بالاکوٹ اس دنیا میں بھی سرخرو ہیں اور انشاء اللہ دربار الٰہی میں بھی باآبرو۔ان کا وہ خونِ شہادت جو ہماری مادی نگاہوں کے سامنے بالاکوٹ کی مٹی میں جذب ہو گیا اور اس کے جو چھینٹے پتھروں پر باقی تھے ۲۶ ذوالقعدہ کی بارش نے ان کو بھی دھو دیا،وہ خون جس کے نتیجے میں کوئی سلطنت قائم نہ ہوئی،کسی قوم کا مادی و سیاسی عروج نہیں ہوا اور کوئی نخلِ آرزو اس سے سرسبز ہو کر بارآور نہیں ہوا،اس خون کے چند قطرے اللہ کی میزانِ عدل میں پوری پوری سلطنتوں سے زیادہ وزنی ہیں،یہ فقیرانِ بے نوا جنہوں نے عالم مسافرت میں بے کسی کے ساتھ جان دی اور جن کی اب دنیا میں کوئی مادی یادگار نہیں،یہ اللہ کے یہاں ان بانیانِ سلطنت اور موسسین حکومت سے کہیں زیادہ قیمتی اور معزز ہیں۔

بے شک شہدائے بالاکوٹ کے خون نے دنیا کے سیاسی و جغرافیائی نقشے میں کوئی فوری تغیر پیدا نہیں کیا،خون شہادت کی ایک مختصر سی سرخ لکیر ابھری تھی،اس کی جگہ نہ جغرافیہ نویس کے طبعی نقشے میں تھی،نہ مورخ کے سیاسی مرقع میں،لیکن کسے خبر کہ یہ خون شہادت دفتر قضاء وقدر میں کس اہمیت واثر کا مستحق سمجھا گیا،اس نے مسلمانوں کے نوشتۂ تقدیر کے کتنے دھبے دھوئے،اس نے اللہ کے یہاں جس کے یہاں محو اثبات کا عمل جاری رہتا ہے یمحو اللہ مایشاء ویثبت وعندہ ام الکتاب کون سے نئے فیصلے کروائے،اس نے کسی مستحکم سلطنت کے لئے خاتمہ و زوال اور کسی پسماندہ قوم کے لئے عروج واقبال کا فیصلہ کروایا،اس سے کس قوم کا بخت بیدار ہوا اور کس سرزمیں کی قسمت جاگی،اس نے کتنی بظاہر ناممکن الوقوع باتوں کو ممکن بنا دیا اور کتنی بعید از قیاس چیزوں کو واقعہ اور مشاہدہ بنا کے دکھا دیا''(۱۴)۔

جارج برنارڈ شا کا کہنا ہے کہ موثر اسلوب بیان اسی شخص کا ہوتا ہے جس کے پاس کہنے کی کوئی بات ہوتی ہے اور جس کا مقصد اپنے خیالات کی تبلیغ ہوتی ہے،چنانچہ جس کا مقصد جتنا اعلی ہوتا ہے اس کا اسلوب بیان بھی اتنا ہی جاندار ہوگا،دوسرے لفظوں میں افادیت اور حسن کاری ادب کی جان ہے،افادی یعنی مقصدی اور پاکیزہ اخلاقی اقدار پر مبنی تعمیری ادب کو''تبلیغی ادب'' کا طعنہ دے کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا،ڈاکٹر عبد المغنی کہتے ہیں:

''بلاشبہ اسلامی ادب تبلیغی ادب ہے،اس کا ایک اعلی مقصد اور وسیع افادہ ہے،اور وہ اس سے کم کوئی چیز نہیں ہے،کہ انسان کی زندگی اپنی تمام تہوں کے ساتھ نکھر جائے اور اپنی تمام پہنائیوں کے ساتھ سنور جائے ، یہاں تک کہ اس کی حدیں زوال وفنا کی

سرحدوں سے آگے بڑھ جائیں اور اس کا عروج سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچ جائے، حق اور حسن دونوں سے مرکب یہی وہ نصب العین ہے جس کو پانے کے لئے اسلامی ادب اپنے قارئین کو ان کی ذمہ داریاں محسوس کراتا ہے، انہیں ایک معاشی حیوان کی بجائے ایک اخلاقی وجود بننے پر اکساتا ہے، یہ ایک تعمیری اور ترکیبی ادب ہے، جس کے اندر فکر وفن کی اخلاقیات اور جمالیات ایک دوسرے کے ساتھ کامل طور سے ہم آہنگ بلکہ مدغم ہیں" (۱۵)۔

اسلامی ادب پر "تبلیغی ادب" کی پھبتی کس کر اس کے گلشن حیات پر بجلی نہیں گرائی جاسکتی نہ ہی اس کی اہمیت وعظمت کو کم کیا جاسکتا ہے، ادب میں افادیت کی کوئی گنجائش ہے تو پھر تو اخلاقی اور مذہبی قدروں کے بغیر ایک قدم بھی آگے بڑھا ہی نہیں جا سکتا، مشہور نقاد پروفیسر محمد حسن کے الفاظ گوش گزار ہوں:

"ادب محض زندگی کا وفا پیشہ عکس نہیں، اس کا معمار بھی ہے اور اس کا رہبر بھی وہ انسانی شعور اور عزم کی تشکیل میں عملی طور پر حصہ لیتا ہے، وہ ان کو نئے خیالات ہی سے آشنا نہیں کرتا بلکہ انسانوں کی ذہنی بلوغت اور بیداری میں بھی حصہ لیتا ہے" (۱۶).....تخلیق دراصل تین سطحوں سے ہو کر گزرتی ہے، وہ اپنے مصنف کی ذات کا اظہار بھی ہوتی ہے، اس کے عصری شعور کی آواز بھی اور اس دور سے پیدا ہونے والی آفاقی اقدار کی گونج بھی، اس لئے ہر دور کے سنجیدہ ادب کا مطالعہ لازمی طور پر مصنف کا مطالعہ، عصر کا مطالعہ اور آفاقی اقدار کا مطالعہ بن جاتا ہے" (۱۷)۔

سرسید، ابوالکلام آزاد، ابوالاعلیٰ مودودی اور آخر میں ابوالحسن علی ندوی مذہبی علماء کے صف اول میں شامل ہیں اور نہ صرف یہ کہ اردو ادب کے صف اول کے نثر نگار ہیں بلکہ صاحب طرز ادیب ہیں اور عموماً مذہبی موضوعات پر لکھتے آئے ہیں اگر ان کی نثر میں ادب کی جلوہ طرازیاں نہیں ہیں تو پھر نثر کیا ہوتی ہے؟!!، اور اگر ان کی نثر افادیت اور حسن کاری کا مینا بازار ہے تو پھر اسلامی ادب کے نام سے افادیت کے ضمن میں مقصدیت اور اخلاقی تعمیری قدروں کا انکار کیوں؟!

ہمیں خوشی ہے کہ اپنے آڑے ترچھے خیالات پیش کرنے کے لئے "سیرت سید احمد شہید" جو افادیت اور حسن کاری کے معیار پر پوری اترتی ہوئی تصنیف لطیف ہے، موضوع گفتگو بنایا ہے، افادی یعنی مقصدی اور تعمیری زاویۂ نگاہ سے دیکھیں تو یہ کتاب اسلام کے پورے فلسفۂ جہاد، نظم سیاست، طرز حکمرانی اور انسان کامل کی تشکیل جدید کی رہبری اور اس راہ میں جدوجہد کی ترجمانی کرتی ہے، یہ ادب اسلامی ہے جو اس حقیقی دنیا سے ماوراء ایک نئی اور وسیع تر دنیا کے لئے جینے کا سلیقہ دیتا ہے، کیونکہ وہ وحی الٰہی کی روشنی سے کسب فیض کرتا ہے، یہی روشنی اسلامی ادیب کے لطیف احساس کو گرماتی ہے، اس کی عقل کو جلا بخشتی ہے اور اس کی فکر کو لاہوتی بنا دیتی ہے، حسن کاری اور جمالیاتی حسیت کا جہاں تک تعلق ہے تو مصنف کی فطرت خود بخود ان کے لالۂ ادب کی حنا بندی کرتی ہے، جس پر علامہ اقبال کا یہ شعر صادق آتا ہے

میری مشاطگی کی کیا ضرورت حسن معنی کو
کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنا بندی

مصنف کی فطرت خود بخود جو لالۂ ادب کی حنا بندی کرتی ہے تو اس کی خوشبو مشام جان کو معطر کرتی رہتی ہے، کیونکہ فطرت سے بڑھ کر کوئی فنکار نہیں، اور فطرت کے حسن اور حق کے جمال کی محاکاۃ اسلامی اور تعمیری ادب ہے۔

حواشی:

(۱) کاروان ادب اسلامی اکتوبر ۹۶ء تا مارچ ۹۷ء ص ۱۴۹۔ (۲) ایضاً ص ۲۱۸۔ (۳) سیرت سید احمد شہید جلد اول ص ۳۹۔ (۴) کاروان ادب دسمبر ۹۸ء ص ۹۰۔ (۵) ایضاً جنوری تا جون ۹۸ء ص ۱۳۴۔ (۶) سیرت سید احمد شہید جلد اول ص ۳۲۔ (۷) ایضاً ص ۳۲۔ (۸) ایضاً ص ۷۳۔ (۹) ایضاً ص ۸۳-۸۴۔ (۱۰) ایضاً ص ۱۱۴۔ (۱۱) ایضاً ص ۱۸۰۔ (۱۲) ایضاً ص ۱۸۸۔ (۱۳) کاروان ادب جون ۹۸ء ص ۱۳۷۔ (۱۴) سیرت سید احمد شہید جلد دوم ص ۴۵۹-۴۶۱۔ (۱۵) اردو افسانہ میں اخلاقی اور تعمیری قدریں (غالباً یہی نام ہے کیونکہ کتاب کے ابتدائی صفحات غائب ہیں، ڈاکٹر عبد المغنی کا مقالہ" اسلامی ادب اور اس کے مسائل ص ۸۰۔ (۱۶) فن تنقید اور اردو تنقید نگاری نورالحسن نقوی ص ۱۷۰۔ (۱۷) ایضاً ص ۱۷۱

☆☆☆

تعارف و تبصرہ

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

نام کتاب: اسلامی خاندان (طبع سوم)
مصنف: مولانا محمد شمشاد ندوی
صفحات: ۲۰۰
قیمت: ۱۰۰
ملنے کے پتے: بہار، راجستھان اور یوپی کے مشہور مکتبے

زیر نظر کتاب ''اسلامی خاندان'' بڑی مفید اور موسوعاتی طرز کی کتاب ہے، اپنے موضوع پر مکمل و مدلل ہے، مصنف نے انتہائی عرق ریزی سے اس کا مواد جمع کیا ہے اور اس طرح وہ اسلامی خاندان کے خطوط واضح کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں، مذکورہ کتاب اسلام کے خاندانی نظام پر سیر حاصل گفتگو کرتے ہوئے بہت سے ذہنی خلجانوں کا حل وعلاج فراہم کرتی ہے، وہ ایک طرف اسلام کے خاندانی نظام کے خدو خال واضح کرتی ہے تو ساتھ ہی اس کی ضرورت کا شدید احساس دلاتی ہے، اس کے فقدان سے پیدا ہونے والے سنگین نتائج بھی درج کرتی ہے، دوسری طرف وہ مغرب کی تباہ کاری اور اس کے بکھرتے خاندانی نظام کو بطور عبرت پیش کرتی ہے۔

اس میں کیا شک کہ اسلام ایک مکمل دین اور کامل نظام حیات ہے، جس طرح اس کا اپنا تعلیمی، سیاسی، معاشی واقتصادی نظام ہے، اسی طرح اس کا اپنا خاندانی نظام Family System ہے، اس سے واقف کرانے کی یہ ایک بڑی خوبصورت و کارآمد کوشش ہے، اس جانب اس قدر توجہ نہیں کی گئی بالخصوص اردو میں جتنی درکار تھی، اور جتنی ہمارے معاشرے کو ضرورت ہے، آج معاشرے کے ہر فرد کو اسلام کے خاندانی نظام سے پورے طور پر واقف کرانے کی شدید ضرورت ہے، اگر مغرب اپنے حال پر ماتم کناں ہے اور اس کی مادیت پسند و برہنہ تہذیب اب اسے آمادۂ خودکشی کر رہی ہے، اس کے مجہول خاندانی نظام نے نہ صرف رشتوں کے تقدس کو پامال کیا ہے بلکہ دوشیزگی کا احساس چھین لیا ہے، اس تہذیب میں عفت و پاکدامنی کا تصور عنقا ہو گیا ہے، حسب ونسب نام کی چیز باقی نہ رہی ہے، مطلقہ عورتوں کی کثرت ہے، بچے ذہنی بیماریوں کا شکار ہو رہے ہیں، بلوغ تک پہنچتے ہوئے جنسی اعتبار سے بوڑھے ہو رہے ہیں، اس تمدن میں بچپن یتیمی ہے تو بڑھاپا اسیری سے کم نہیں، ان ناگفتہ بہ حالات میں اگر پوری طاقت کے ساتھ مسلمان اپنے مثالی خاندانی نظام کو علمی و عملی بہر دو اعتبار پیش کرتے تو اسلام کی نشر اشاعت میں بڑی مدد ملتی، ہمارے یہاں کثرت سے علحدہ ہر ایک کے حقوق تو بیان کیے جاتے ہیں لیکن اسلام کے مکمل خاندانی نظام پر بالخصوص اردو میں تحریریں کمیاب ہیں، جس کے سبب معاشرے میں ایک اضطراب پایا جاتا ہے، ہر گھر مسائل سے دو چار ہے، عدالتیں ان لوگوں کے گھریلو مسائل پر مشتمل مقدمات سے پٹی پڑی ہیں جو اپنا ایک مستقل خاندانی نظام رکھتے ہیں، اس کا سبب جہاں ایک طرف بے عملی ہے وہیں دوسرا بڑا سبب خاندانی نظام سے عدم واقفیت ہے، ہر شخص اپنے آپ کو سربراہ سمجھتا ہے، اپنا ہی حق اسے نظر آتا ہے وہ دوسروں کے حقوق اور کارکردگی سے ناواقف ہوتا ہے۔

اس لحاظ سے یہ بڑی مفید کاوش ہے، جس کو متعدد اہل علم نے سراہا ہے، کتاب کے شروع میں مصنف کے ''ابتدائیہ'' کے ساتھ تقریظات کا ایک سلسلہ ہے، پھر اصل مباحث ہیں، باب اول کا مرکزی عنوان کچھ اس طرح ہے ''جدید معاشرے میں خاندانی نظام کی ابتری'' اس باب میں موصوف نے مغرب کے نظریہ زندگی پر روشنی ڈالنے کے ساتھ اس کے خاندانی نظام پر گفتگو کی ہے اور اس کے مضر اثرات کو واضح کیا ہے، ساتھ ہی اس کے سنگین نتائج پر دانشوران ومفکرین کی فکرمندی کا بھی ذکر کیا ہے اور بالآخر اسلام کے خاندانی نظام کو امن وسکون اور ترقی واستحکام کا ضامن قرار دیا ہے، دوسرا باب ''اسلام کا خاندانی نظام'' ہے اس میں متعدد ذیلی عناوین ہیں، مگر جلی عناوین کا تذکرہ ضروری ہے جو کچھ یوں ہیں خاندان کی تاسیس، نکاح کے مقاصد، احساس ذمہ داری، خاندانی اختلافات کے اسباب، اسلامی خاندان میں تعدد ازدواج، مطلقات اور بیواؤں کی شادی، اسلامی خاندان میں عفت (بقیہ صفحہ نمبر ۶۴ پر)

آخری صفحہ

نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

امام ربانی قطب عالم حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کا واقعہ تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ دیوبند کی جامع مسجد میں ایک معمولی سی کتاب لے کر تقریر شروع کر دی اور درمیان میں کسی مناسبت سے ''اللہ'' ایسے سوز وگداز سے کہا کہ پورا مجمع بے قابو ہوگیا اور درو دیوار ذکر خداوندی سے گونج گئے۔ شیخ السلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے درس حدیث کے شرکاء بتاتے ہیں کہ جس وقت آپ مسند حدیث پر تشریف فرما ہوتے تو روحانیت کا ایک سیلاب ہوتا کہ الفاظ اس کیفیت کو بیان کرنے سے قاصر ہیں۔

یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ وعظ ونصیحت، تقریر وتحریر اور پند وموعظت میں تأثیر اور اثر انگیزی، سحر انگیزی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب مقرر اور محرر واعظ وناصح صرف ''قال'' کا ترجمان نہ ہو، بلکہ حال کا عکاس ہو۔

یعنی کہنے والے کی زبان نے وہی کچھ کہا ہو اور قلم نے وہی کچھ لکھا ہو جس پر وہ عملی زندگی میں عمل پیرا ہو۔

مولانا نور عالم خلیل امینی صاحب نے کیا ہی حقیقت کا اظہار کیا ہے: مقرر وواعظ کی خوش بیانی اور مضمون نگار اور قلم کار کی سحر نگاری، اسی وقت دو آتشہ ہوتی ہے جب بقول جگر وہ سرور وعشق سے سرشار ہو، اور اس کے چہرے سے ایمان ویقین کی روشنی پھوٹی پڑتی ہو۔ علامہ اقبالؒ نے معجزۂ فن کی نمود کے لئے خون جگر کی آمیزش کو شرط قرار دیا ہے۔ خود ان کے کلام کی معجزانہ تأثیر کی اصل وجہ یہی خون جگر ہے۔

خونِ جگر ایسا کیمیا ہے کہ اس کی وجہ سے نہ صرف چنگ ورباب اور حرف وصوت میں جادو کی تاثیر پیدا ہوجاتی ہے بلکہ سنگ جیسی بے جان وبے آواز اشیاء میں بھی دل کشی ودل ربائی کی بھرپور صلاحیت عیاں ہوجاتی ہے۔ ؎

نقش ہے سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہیں سودائے خام، خونِ جگر کے بغیر

خلاصہ یہ کہ واعظ کا ارشاد ہر طرح بجا ہونے کے باوجود اور نو یسندہ کی تحریر بہت دل چسپ ہونے کے باوصف، اسی وقت دل وجگر میں سماتی ہیں اور عقل وخرد کو شکار کرتی ہیں جب ان دونوں کا سرچشمہ اخلاص ہو اور دل وزبان کے اتحاد کا نتیجہ ہوں۔

جو تقریر یا تحریر اس شرط یا وصف سے عاری ہوتی ہے، وہ کسی ٹھوس انقلاب حال کا ذریعہ نہیں بنتی۔ وقتی طور پر کچھ مؤثر بھی ہو تو دل ونگاہ کے بگاڑ کو باقاعدہ طور پر دور کرنے میں مدد ومعاون نہیں ہو پاتی۔

یہ ایسا مسئلہ ہے جس پر انسانی دنیا کے تمام عقلاء ومفکرین کا اتفاق ہے، کسی مذہب ومسلک کے کسی صحیح المزاج، امام، یا مفتی، کا اس حوالے سے کوئی اختلاف آج تک میری نظر سے نہیں گزرا۔ (مستفاد مقدمہ دعوتِ فکر وعمل)

(م۔ق۔ن۔)

☆☆☆

(بقیہ صفحہ نمبر ۶۲ کا) ...... و پاکدامنی، اسلامی خاندان میں اولاد کی تعلیم و تربیت، ان کے علاوہ اور بھی بہت سے عناوین ہیں جن میں والدین، پڑوسیوں، رشتہ داروں کے حقوق اور ان کے ساتھ حسن سلوک پر گفتگو ہے، اسی طرح عمر دراز لوگوں کے ساتھ برتاؤ، عام مسلمانوں اور انسانی برادری کے ساتھ سلوک نیز میراث کی منصفانہ تقسیم جیسے اہم موضوعات کو بھی اختیار کیا گیا ہے، حرف آخر کے تحت خلاصہ کتاب درج کیا گیا ہے، آخر میں مراجع و مصادر کی فہرست درج کی گئی ہے جس میں عربی واردو کی اساسی اور ثانوی مرجع کی حیثیت رکھنے والی ۳۲ کتابیں ہیں۔

کتاب کے مشمولات میں اگر اس بحث کا اضافہ ہوتا کہ اسلام کا مطلوبہ خاندانی نظام مشترکہ خاندانی نظام Combined family system ہے یا علحدہ خاندانی نظام Seprate family system تو کتاب کی افادیت دوبالا ہوجاتی، اس لیے کہ ہمارے معاشرہ میں جو گھر مسائل سے دوچار ہیں اس میں ایک بڑا سبب اس بحث کے غیر واضح ہونے اور اس سے متعلق صحیح تعامل نہ ہونا بھی ہے، البتہ مصنف کے طرز بحث سے یہ آشکار ہے کہ مصنف کتاب علحدہ خاندانی نظام کو ہی اسلام کا مطلوبہ خاندانی نظام تصور کرتے ہیں اور یہی صحیح بھی ہے، اسی لیے انہوں نے خاندان کے چار ارکان کا ذکر کیا ہے جس میں شوہر، بیوی، والدین اور اولاد ہیں، پھر آگے دیگر متعلقین کے علحدہ حقوق اور ان سے حسن سلوک کو بیان کیا ہے۔

مختصر یہ کہ یہ کتاب بہر لحاظ مفید ہے، ہماری بڑی ملی تنظیموں کو چاہیے کہ وہ ہر مسلمان کو اپنے خاندانی نظام سے واقف ہونے اور پرسکون و اطمینان بخش زندگی گزارنے کے لئے اس کتاب کو پڑھنے کی تلقین کریں، امید ہے کہ اس کی آئندہ طباعت جلد ہی ہوگی اور وہ اس کی افادیت کے پیش نظر دیدہ زیب بھی ہوگی اور اس میں کچھ مزید مفید اضافے ہوں گے، عہد حاضر کے مشہور صاحب قلم مولانا نور عالم خلیل امینی صاحب نے اپنی تقریظ میں صحیح لکھا ہے ''......کتاب اگر مواد سے بھرپور ہو، اسلوب تحریر دلکش ہو، زندہ رہنے اور قارئین کو پڑھنے کے لیے مجبور کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ جیسا کہ موصوف کی یہ کتاب ہے۔ تو پھر کسی مقدمے، تقریظ اور تعریف کی ضرورت نہیں ہوتی''۔

☆☆☆

جامعۃ البنات حیدرآباد
JAMIATUL BANATH HYDERABAD
شعبہ حفظ عالمیت فضیلت
لڑکیوں کا اعلی و معیاری دینی ۲۸ سالہ قدیم جامعہ
شہر کے اہم مقامات سے بسوں کی سہولت
دینی تعلیم کے علاوہ انگریزی و کمپیوٹر بھی سکھایا جاتا ہے۔ جس کے لئے خاص کمپیوٹر لیب پوری ضرورتوں سے آراستہ ہے۔
عثمانیہ یونیورسٹی (اورینٹل لینگویجس) کے ذریعہ میٹرک، انٹر، بی اے کے امتحانات بھی دلوائے جاتے ہیں۔
ایک سالہ اسلامک ڈپلومہ (کالج کی طالبات کے لئے) شعبہ تربیت۔ دبلوم العالی فی علوم الشرعیہ۔
(فارغات دینی مدارس کے لئے ایک نادر موقع)
والدین سے گزارش ہے کہ اپنی لڑکیوں کی بہترین تعلیم و تربیت کے لئے اس جامعہ میں داخلہ دلوائیں۔
نوٹ: (۱) اضلاع کے طالبات کے لئے جامعہ میں معیاری ہاسٹل کی سہولت ہے۔ (۲) شہر میں اس جامعہ کی اور کوئی شاخ نہیں ہے۔
صاحب خیر حضرات جو جامعہ کا تعاون کرنا چاہتے ہیں ہمارے بینک اکاونٹ نمبرس:
JAMIATUL BANATH HYDERABAD
Ac/No. 05110011021119. (Andhra Bank)
Ac/No. 19380100018623 (Bank of Baroda)
پتہ: جیون یار جنگ کالونی، روبرو مدینہ میڈیکل ہال، VIP اسکول کی گلی، سعید آباد، حیدرآباد۔
رابطہ نمبر: 7032101979,9848431304,(040)24553534
Website:www.jamiatulbanath.org